

# پیامِ اقبال

بنام نوجوانانِ ملت

[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)



سید قاسم محمود



## معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مَجْلِسُ التَّحْقِیْقِ الْإِسْلَامِیِّ کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

## تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے  
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی  
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

**PDF** کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے  
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ [KitaboSunnat@gmail.com](mailto:KitaboSunnat@gmail.com)

🌐 [www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

# پیامِ اقبال

## بنام نوجوانانِ ملت

مؤلف:  
سید قاسم محمود

www.KitaboSunnat.com

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

851-8

قسط ۶

ناشر

محمد سہیل عمر

ناظم

اقبال اکادمی پاکستان

(حکومت پاکستان، وزارت ثقافت)

چھٹی منزل، ایوان اقبال، لاہور

Tel: [+92-42] 6314-510

Fax: [+92-42] 631-4496

Email: director@iap.gov.pk

Website: www.allamaiqbal.com

ISBN 969-416-345-5

طبع اول : ۲۰۰۳ء

طبع دوم : ۲۰۰۹ء

تعداد : ۱۰۰۰

قیمت : ۳۵۰ روپے

مطبع : شرکت پریس، لاہور

محل فروخت: ۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور فون نمبر: ۷۳۵۷۲۱۳

www.KitaboSunnat.com

## فہرست مضامین

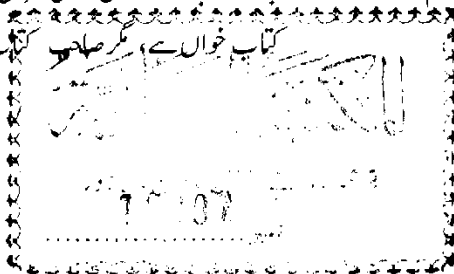
تعارف

تمہید

- ۱ باب نمبر ۱  
پیامبر اقبال  
علامہ اقبال کے مختصر سوانح، از ولادت ۱۹ نومبر  
۱۸۷۷ء تا وفات ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء
- ۳۹ باب نمبر ۲  
پیام منظوم  
اردو کے چار اور فارسی کے آٹھ مجموعہ ہائے  
کلام کا تعارف
- ۵۱ باب نمبر ۳  
پیام اقبال کا ارتقا  
تینوں تخلیقی ادوار میں اقبال کا مخاطب  
صرف نوجوان ہے۔
- ۷۱ باب نمبر ۴  
خودی  
خودی کا سر نہاں، لا الہ الا اللہ  
خودی ہے تنق فساں، لا الہ الا اللہ
- ۱۰۷ باب نمبر ۵  
فقر  
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور  
قلندری مری کچھ کم، سکندری سے نہیں
- ۱۱۷ باب نمبر ۶  
عشق  
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے  
مرا عشق، میری نظر بخش دے



- باب نمبر ۷  
عشق قرآن  
۱۲۹ قرآن میں ہو غوطہ زن، اے مردِ مسلمان  
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
- باب نمبر ۸  
عشق رسولؐ  
۱۳۷ قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے  
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے
- باب نمبر ۹  
مومن  
۱۶۵ یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن  
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن
- باب نمبر ۱۰  
شاہین  
۱۷۵ تو شاہین ہے، پرواز ہے کام تیرا  
ترے سامنے آسمان اور بھی ہیں
- باب نمبر ۱۱  
علم و عقل  
۱۸۵ یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبیر، یہ حکومت  
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
- باب نمبر ۱۲  
مغربی تعلیم  
۱۹۳ تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تُو  
کتابِ حوالہ ہے، مگر صاحبِ کتاب نہیں





۲۰۳

دنیا کو ہے پھر معرکہ رُوح و بدن پیش  
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

باب نمبر ۱۳

مغربی تہذیب

۲۱۵

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا  
ہوتا ہے جادہ پیا، پھر کارواں ہمارا

باب نمبر ۱۴

اسلام کی نشأتِ ثانیہ

۲۳۱

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ  
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

باب نمبر ۱۵

بنام دخترانِ ملت

۲۴۹

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری  
زندگی شمع کی صورت ہو خُدا یا میری

باب نمبر ۱۶

بنام نونہالانِ ملت

۲۵۷

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر  
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

باب نمبر ۱۷

پیامِ بذریعہ جاوید

۳۲۵

اقبال کی تقاریر، بیانات، اعلانات اور خطوط سے  
شاہکارِ نثر پاروں کا انتخاب

باب نمبر ۱۸

پیامِ منشور

۳۴۵

کتابیات







انتساب:

حافظ عاکف سعید کے نام



## تعارف

بچوں کے لیے اقبال پر کام کرنا، کچھ ”سالِ اقبال“ ہی پر موقوف نہ تھا، اقبال اکادمی پاکستان نے اُن کے لیے دور رس اور مستقل نوعیت کے متعدد پروگرام بنا رکھے ہیں، جن میں سے بعض زیر تخیل ہیں، کیونکہ اُن کے تکمیلی مراحل خاصے طویل ہیں۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ”سالِ اقبال“ کے موقع پر اقبال اکادمی نے بچوں کے لیے جو طرح طرح کے اشاعتی، سمعی و بصری پروگرام مرتب کیے، اتنی سنجیدگی، دل جمعی اور لگن کے ساتھ اس سے پہلے کبھی اور کہیں بھی مرتب نہ ہوئے تھے۔ اُن کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

علامہ اقبال نے بچوں کے لیے جو نظمیں کہی ہیں، اُن کی اشاعت کے لیے خصوصی کُلیات مرتب کیا گیا ہے۔

اقبال اکادمی نے پاکستان ٹیلی ویژن کے ساتھ مل کر بارہ حصوں پر مشتمل ”آئینہ اقبال“ کے نام سے علامہ اقبال پر تعارفی پروگرام پیش کیا۔  
”ذوق آگہی“ کے عنوان سے طلبہ و طالبات کے لیے ٹی وی کوئز مقابلے پاکستان کے اہم ٹی وی مراکز سے منعقد کرائے گئے۔

اسی طرح ریڈیو پاکستان کے معلوماتی مذاکروں میں شرکت کی گئی اور ”اقبال کوئز نیشنل چیلنج ٹرائی“ کا پروگرام پیش کیا گیا۔

”سالِ اقبال“ کے حوالے سے ایک اہم کام آڈیو، وڈیو ڈیز ہیں، جن میں سے تین دستاویزی فلموں کی حامل ہیں۔ تین سی ڈیز وڈیو موسیقی کی، تین کلامِ اقبال (اردو) کی آڈیو اور تین ملٹی میڈیا کی ہیں۔ یہ سی ڈیز بڑوں کے ساتھ ساتھ نوجوانوں اور بچوں کے لیے بھی ہیں۔

ایک اور اہم بلکہ خصوصی پیش کش ”آل پاکستان ویب سائٹ مقابلہ“ ہے۔ یہ مقابلہ ۵۱۵ گروپوں کے درمیان ہوا جس میں ملک بھر کے ایک ہزار سے زیادہ نوجوانوں نے شرکت کی۔ اُنھوں نے کل ۱۲۴ ویب سائٹس بنائی تھیں، جن میں سے ۸۰ ویب سائٹس معیاری قرار دی

نگیں۔ ان مقابلوں میں جیتنے والوں کو انعامات دیے گئے۔

جدید عصری تقاضوں اور خصوصاً نوجوانوں کی تعلیمی و علمی ضروریات کے پیش نظر پیام اقبال عام کرنے کے لیے ”اقبال اکاوی پاکستان“ نے ایک بہت بڑی ویب سائٹ تیار کی ہے۔ اس ویب سائٹ پر علامہ اقبال کے تمام اردو، فارسی اشعار، اُن کے تراجم، اُن کی خطاطی، موسیقی، وڈیو، علامہ صاحب کی تصاویر اور حالاتِ زندگی کے علاوہ بہت سی ایسی معلومات یکجا مل جاتی ہیں جن کا جاننا ہر نوجوان کے لیے ضروری ہے۔

اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کو اقبال سے متعارف کرانے کے لیے ایک سفری نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ اس نمائش میں علامہ صاحب کی زندگی کے مختلف ادوار اور مواقع کی تصاویر، اہم واقعات، خیالات و افکار اور کتب و رسائل اس ترکیب و ترتیب سے پیش کئے گئے ہیں کہ نمائش میں گزرتے ہوئے اور ایک ایک چیز کو دیکھتے ہوئے علامہ صاحب کی حیات، شاعری اور افکار کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔

ایک اور قابل ذکر کام ”میرا اقبال“ ہے۔ یہ چوتھی جماعت سے آٹھویں جماعت تک کے بچوں کے لیے پانچ علمی کتابوں کا ایک مفید سلسلہ ہے۔ اس کا مقصد بچوں میں اردو شاعری کا ذوق پیدا کرنا اور انھیں اقبال کے افکار و خیالات سے روشناس کرانا ہے۔ ہر کتاب کی اہم خصوصیات یہ ہیں: اقبال کے حالاتِ زندگی، اُن کی سرگرمیاں، منظومات کا انتخاب، بنیادی تصورات، سوالات، کیا آپ جانتے ہیں، پڑھ لکھیں، فرہنگ، میری بیاض۔ اب ان پانچوں کتابوں کے ساتھ ہی سی ڈیز تیار کی جا رہی ہیں ان کو جان داری (Animation)، سوال جواب، کھیل اور مشقوں کے ذریعے علامہ کی زندگی، شاعری اور تعلیمات کو بچوں اور نوجوانوں کے لیے انتہائی دلچسپ انداز میں پیش کیا جائے گا۔ اس سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے ”میرا اقبال“ ہی کے عنوان کے تحت چھٹی سے دسویں کتاب تک، یعنی نویں جماعت سے بی اے کے موجودہ نصاب کو مد نظر رکھ کر تیار کی جا رہی ہیں، جن کو نصاب میں شامل کرانے کی کوشش کی جائے گی۔

”اقبال کی پھولاری“ کے بغیر بچوں کے پروگراموں کا باغ سونا سونا نظر آئے گا۔ ”پھولاری“ میں معروف اداکار اور صداکار شجاعت ہاشمی صاحب کے تعاون سے علامہ اقبال کی نو نظمیں منتخب کر کے ملک کے بہترین موسیقاروں سے خوب صورت اور سریلی دھنوں میں تیار کرائی گئی ہیں۔ موسیقی سے معمور یہ نظمیں ۹ ٹیبلو کی شکل میں بہترین Sets، کوریوگرافی، میک اپ اور اچھی روشنیوں کے ذریعے وڈیو پر منتقل کی گئی ہیں۔ ان کا اصل مقصد ”پیام اقبال“ ننھے منے

بچوں کے ذہنوں تک منتقل کرنا ہے۔

مصوری کے کل پاکستان مقابلے بھی منعقد کرائے گئے، جن کے تحت نوجوان مصوروں کو اقبال کا پورٹریٹ بنانے کی دعوت دی گئی تھی۔ مقابلے میں ہر عمر کے مصوروں کو شریک ہونے کا موقع دیا گیا۔ اقبال پر موضوعاتی مصوری کے مقابلے میں بھی ہر عمر کے مصور شریک ہو سکتے تھے۔ موضوعاتی مصوری کا ایک مقابلہ کالج اور یونیورسٹی کے نوجوان طلبہ و طالبات کے درمیان ہوا۔ ثانوی سکول کے طلبہ و طالبات کے لیے بھی مقابلہ کرایا گیا، جس میں ۲۴۲ تصویریں موصول ہوئیں، جن کے نتائج مرتب کر کے حق دار مصوروں کو انعامات اور اسناد دی گئیں۔

”اقبال اور نوجوان“ کے عنوان کے تحت کئی منصوبے زیر تکمیل ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال پر آن لائن نصاب شروع کرنے کا منصوبہ۔ ایک ”اقبال الیم“ تیار ہو رہی ہے جو بڑے سائز میں ۲۰۰ رنگین صفحات پر مشتمل ہوگی۔ تصاویر کی سی ڈی بھی جلد مکمل ہونے والی ہے، جس میں تقریباً ۵۰۰ تصاویر شامل ہیں۔

اس سلسلہ ہائے درازی کی ایک کڑی بچوں اور نوجوانوں کے لیے کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔ ملک کے نامور ادیبوں اور مصنفین سے علامہ اقبال کے خاص حوالے سے کتابیں لکھوائی گئی ہیں۔ ان کتابوں کے نام ہی ان کے متن کی تشریح ہیں: مقدر کا ستارہ، سراغ زندگی، سلسلہ حکایات اقبال (بچوں کے لیے) اور سلسلہ حکایات اقبال (نوجوانوں کے لیے)۔ یہ کتاب ”پیام اقبال بنام نوجوانان ملت“ بھی ان کتب میں شامل ہے۔ اسے ہمارے ملک کے ممتاز ادیب و مدیر جناب سید قاسم محمود صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس کا ایک ایڈیشن ”قرآن اکیڈمی، لاہور کے زیر اہتمام طبع ہوا تھا۔ اب اضافہ جات کے ساتھ توسیعی ایڈیشن ”اقبال اکادمی پاکستان“ کی جانب سے شائع ہو رہا ہے۔ ہم کارپردازان ”قرآن اکیڈمی“ اور سید قاسم محمود صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے نوجوانان ملت تک اقبال کا پیام پہنچانے میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ بچوں کے لیے تعلیمی مواد تیار کرنے کے معروف ادارے ایجوکیشنل ریسورس ڈویلپمنٹ سنٹر، کراچی نے کتاب کو ”حسن صورت سے آراستہ کرنے میں، اس کے متن کی تزئین اور صفحہ بندی کے فنی مراحل میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ ہم ان کے بھی سپاس گزار ہیں۔

ناشر



## تمہید

جب ”سالِ قائد اعظم“ (۲۰۰۱ء) کے حوالے سے سرکاری سرگرمیوں کا اختتام ہونے لگا تو حکومت پاکستان نے ۲۰۰۲ء کو علامہ اقبال کے ۱۲۵ ویں سالِ ولادت کی نسبت سے ”سالِ اقبال“ قرار دینے کا اعلان کیا۔ مختلف اشاعتی اداروں نے اقبالیات کے شعبے میں اپنے اپنے پروگرام مرتب کیے۔ ظاہر ہے کہ ”اقبال اکادمی پاکستان“ کو اقبال سے نسبتِ خاص کے باعث پیش پیش رہنا چاہیے تھا۔ ”مرکزی انجمن خدام القرآن“ کو بھی خیال آیا کہ سالِ اقبال کے دوران میں ہونے والے علمی و تحقیقی کاموں میں انجمن کو بھی شریک ہونا چاہیے۔ اس انجمن کے صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو قرآن کے ساتھ ساتھ عاشقِ رسول علامہ اقبال سے بھی ایک خاص جذباتی اور قلبی لگاؤ ہے۔ اُن کا کوئی بھی خطبہ، مقالہ، تقریر اور تحریر ایسی نہیں ہے، جس کے متن کے جوہر میں روحِ اقبال شامل نہ ہو۔

”سالِ اقبال“ کے سرکاری اعلان سے کچھ عرصہ پہلے میں ڈاکٹر صاحب کی ”تنظیمِ اسلامی“ کے ہفت روزہ ”ندائے خلافت“ کا ”فلسطین نمبر“ مرتب کر چکا تھا۔ انجمن نے طے کیا کہ ”فلسطین نمبر“ کی طرح ”ندائے خلافت“ کا ”اقبال نمبر“ شائع کیا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے بھی قرعہٴ فال دیوانے کے نام نکلا۔ امیرِ تنظیم اور مدیر ”ندائے خلافت“ حافظ عاکف سعید صاحب سے مشاورت ہوئی کہ ”اقبال نمبر“ تو بے شمار جرائد نکال چکے ہیں اور ان گنت رسائل اب بھی نکالیں گے، کیوں نہ اقبالیات کے کسی خاص موضوع کے لیے کام کیا جائے۔ حافظ صاحب کا خیال تھا کہ آج سب سے بڑا مسئلہ نوجوانانِ ملت کی تعلیم اور اُن کی کردار سازی کا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کروڑوں نفوس کا یہ قافلہٴ سخت جاں جائے تو کدھر جائے۔ پس اس موضوع کو محدود و مخصوص کر کے ”نوجوانانِ ملت کے نامِ اقبال کا پیغام“ یکجا کرنے کا کام شروع ہوا۔ کام شروع ہوا تو چند سوالات مجھے تنگ کرنے کے لیے کافی تھے۔ اول یہ کہ اقبال کے کلامِ نظم و نثر کے علاوہ مختلف کتب خانوں میں اقبال پر جو یہ ہزار ہا کتب و رسائل کا انبار ہے، اس میں سے وہ خاص جواہر



ریزے کیوں کر پٹے جائیں جو بچوں کی تعلیم اور کردار سازی میں کام آئیں؟ دوسرا سوال یہ تھا کہ کس عمر تک کے بچوں کے لیے اقبال کا پیام مرتب کیا جائے؟ بچوں اور نوجوانوں میں کیا فرق ہے؟ بچوں کے لیے تو ”ایک پہاڑ اور گلہری“، ”ایک گائے اور بکری“، ”ایک کڑا اور مکھی“ جیسی چند نظمیں سیکھا جاسکتی ہیں تو چند اوراق نہیں گئے۔ لہذا چھوٹے بچوں کے ساتھ بڑے بچوں کو بھی شریک کرنا پڑے گا۔ بڑے بچوں سے کیا مراد ہے؟ اقبال کا شعر اتنا بلند بھی ہے کہ آج تک بڑے بڑے دانشور، اساتذہ اور نقادانِ فن اُس کی بلندی تک پہنچنے کے لیے فکری کاوشیں کرتے رہے ہیں، اور ایسا زود فہم بھی کہ عوام الناس چلتے پھرتے گنگنا کر اپنی عملی زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

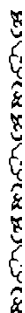
میں یہ چند سوالات لے کر ”اقبال اکادمی پاکستان“ کے ڈائریکٹر محمد سہیل عمر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ ڈائریکٹر سے زیادہ اقبالیات کے ماہر خصوصی ہیں اور یہی اُن کی وجہ شہرت ہے۔ اُن سے بالمشافہ گفتگو کے بعد طے پایا کہ پرائمری کلاسوں میں زیر تعلیم بچوں سے لے کر کالجوں میں نئے نئے داخل ہونے والے طلبہ و طالبات تک، سب کو ”نوجوان“ کہا جائے، اور ان کے لیے ”پیام اقبال“ اس ترکیب سے مرتب کیا جائے کہ ہر نوجوان اپنی اپنی عمر، اپنی اپنی ذہانت اور افتادِ مزاج کے مطابق اُس سے فائدہ اٹھائے۔

سہیل صاحب نے ”اقبال اکادمی“ کی لائبریری سے ایسے مقالات اور مضامین کی ایک طویل فہرست بھی میرے حوالے کر دی، جو گزشتہ پچاس ساٹھ سال کے دوران میں ہمارے علماء و فضلاء نے اس خاص موضوع ”پیغام اقبال: نوجوانوں کے نام“ پر تحریر کئے تھے۔ نہ صرف فہرست عطا کی، بلکہ یہ مقالات جن جن رسائل و جرائد میں شامل تھے، اُن سے نکال کر نوٹوں کا پیاں بھی مہیا کیں۔ یہ مقالات میرے لیے اندھیرے میں جگنو ثابت ہوئے۔ میں اُن کی روشنی میں اقبال کے پاس گیا۔ اقبال کے تمام اردو اور فارسی شعروں سے میں گزرا اور جس جس شعر میں مجھے نوجوانوں کے لیے کوئی پیغام نظر آیا، اُن کو الگ کاغذ پر درج کرتا رہا۔ پھر ان تمام پیغامات کو موضوع دار الگ الگ لکھ کر کمپیوٹر کے حوالے کر دیا۔ ”ندائے خلافت“ کے شمارہ خاص کی پہلی کاپی لے کر میں پھر سہیل عمر صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کہا: ”یہ کام تو دراصل اقبال اکادمی کے کرنے کا تھا۔ قرآن اکیڈمی نے کر دیا۔“ میں نے کہا ”دونوں اکادمیاں ایک جیسا کام کر رہی ہیں۔ نوجوان قرآن کی طرف رجوع کرے گا، وہ اقبال کے پاس ضرور جائے گا۔ اور نوجوان اقبال کے پاس جائے گا، وہ قرآن کی طرف ضرور رجوع کرے گا۔“

سہیل صاحب نے فرمائش کی کہ اگر ”ندائے خلافت“ کے اس شمارے میں توسیع کی جائے اور جو باتیں رسالے کی تحدید و تعین کے باعث شامل نہ ہو سکیں، وہ ایذا کر کے کتابی صورت دے دی جائے تو اقبال اکادمی اس کی اشاعت کی ذمہ داری لے سکتی ہے۔ میں نے یہ ذمہ داری قبول کر۔ دریں اثنا قرآن اکیڈمی کی جانب سے ”ندائے خلافت“ کا ”اقبال نمبر“ بھی کتابی صورت میں شائع ہو گیا، اور اب دو برس کے بعد ”اقبال اکادمی“ کے زیر اہتمام ”پیام اقبال: نوجوانان ملت کے نام“ ہی کے زیر عنوان توسیع پذیر ہو کر، حاضر خدمت ہے۔ دونوں کتابوں کا پیغام ایک ہی ہے، جس سے اثر لے کر ایک نوجوان بھی اگر اقبال کی مجلس میں آ گیا تو میں سمجھوں گا کہ محنت ٹھکانے لگی۔

سید قاسم محمود





باب نمبر ۱

# پیامبر اقبال





یہ عجب حسن اتفاق ہے کہ انیسویں صدی کا آٹھواں عشرہ بڑا ہی مردم خیز تھا۔ لینن (۱۸۷۰ء)، فلسفی برنڈرسل (۱۸۷۳ء)، چرچل اور ناول نگار سمرسٹ ماہم (۱۸۷۴ء)، امریکی ناول نویس تھامس مان (۱۸۷۵ء)، رضا شاہ اول (۱۸۷۶ء)، جرمنی کا چانسلر ایڈی نار (۱۸۷۷ء)، علامہ محمد اقبالؒ (۱۸۷۷ء)، مولانا محمد علی جوہر، کمال اتاترک اور قائد اعظمؒ (۱۸۷۶ء)، روسی سیاست دان ٹرائسکی، اسٹالن اور سائنس دان آئن سٹائن (۱۸۷۹ء) سب اسی عشرے کی پیداوار ہیں۔ گویا قدرت دنیا کے مختلف گوشوں اور شعبوں میں جو انقلاب لانا چاہتی تھی، اُس کی داغ بیل اسی عشرے میں ڈالی گئی۔

### خاندانی پس منظر

علامہ اقبالؒ کے اجداد ہندو برہمن تھے۔ مغلوں کے دورِ حکومت میں کشمیر میں بے شمار صوفیائے کرام باہر سے تشریف لائے، جنہوں نے اپنے اعلیٰ کردار اور حسن سلوک سے مقامی ہندو آبادی کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور وہ جوق در جوق اسلام قبول کر کے اُن کے حلقہٴ ارادت میں شامل ہونے لگے تھے۔ ۱۶۵۰ء کے لگ بھگ سری نگر میں ایک سید درویش وارد ہوئے۔ علامہ اقبالؒ کے جد امجد بھی اُن کی زیارت کے لیے سری نگر آئے۔ اس مردِ قلندر کی نگاہ کام کر گئی اور انہوں نے اس درویش کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اُن کا نام صالح رکھا گیا اور وہ بعد ازاں ”بابا صالح“ کے نام سے مشہور ہوئے۔ سید درویش نے اُن کے تقویٰ سے متاثر ہو کر اپنی دُختر نیک اختر کا نکاح بھی اُن سے کر دیا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خاندانی پس منظر کو یوں بیان کیا ہے:



میں اصل کا خاص سوماتی

آبا میرے لاتی و مناتی

علامہ اقبال کے جد شیخ محمد رفیق کی پہلی شادی سیال کوٹ کے ایک کشمیری خاندان میں ہوئی۔ اس بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ دوسری شادی جلال پور جٹاں کے ایک کشمیری خاندان میں ہوئی۔ اس بیوی سے دس لڑکے پیدا ہوئے، لیکن سب ایک ایک کر کے داغ مفارقت دے گئے۔ شیخ نور محمد (علامہ اقبال کے والد) گیارہویں اولاد تھے۔

شیخ نور محمد کو اپنے خاندان میں ”میاں جی“ کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ پہلے انھوں نے گزر اوقات کے لیے، بچوں کے کُرتے بنانے شروع کیے۔ پھر جب سیال کوٹ میں ایک ڈپٹی وزیر علی بلگرامی قیام پذیر ہوئے تو شیخ نور محمد نے اُن کے ہاں کپڑے سینے کی ملازمت اختیار کر لی۔ بلگرامی نے شیخ صاحب کو ”سنگر“، مشین خرید کر دی جو اُس زمانے میں ایک نادر چیز سمجھی جاتی تھی۔ بلگرامی کی ملازمت میں خاصی بچت ہو جاتی تھی، لیکن اقبالؒ کی والدہ امام بی بی گھر میں اُن کی تنخواہ کا ایک پیسا بھی خرچ نہ کرتی تھیں۔ اُن کے خیال میں بلگرامی کی آمدنی حلال نہیں تھی۔ اپنی تنخواہ کی پذیرائی کا حال دیکھا تو انہوں نے ملازمت چھوڑنے ہی میں عافیت سمجھی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ اُن کا نیا کاروبار ٹوپیاں سینے کا تھا۔ اس کاروبار نے اتنی ترقی کی کہ انھیں گاہکوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے کئی ملازم رکھنے پڑے۔ بعد میں جب اُن کی عمر زیادہ ہو گئی تو انھوں نے یہ کام اپنے داماد غلام محمد کے حوالے کیا، جس کی لا پرواہی سے کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ علامہ اقبال کی والدہ امام بی بی خاندان میں ”بے جی“ کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ وہ لکھنا پڑھنا نہ جانتی تھیں، لیکن صوم و صلوة کی بڑی پابند تھیں۔ حسن سلوک





کے باعث سارا محلہ اُن کا گرویدہ تھا۔ اُن کی دیانت داری کا یہ حال تھا کہ محلے کی اکثر عورتیں آپ کے پاس زیورات، نقدی اور دیگر قیمتی اشیاء بطور امانت رکھتی تھیں۔ محلے یا برادری میں خواتین کی آپس میں کبھی تو ٹکار ہو جاتی تو ”بے جی“ کو ثالث مقرر کیا جاتا۔ وہ غریب عورتوں کی خفیہ امداد بھی کرتی رہتی تھیں۔ ایسا بھی ہوا کہ وہ اپنے گھر غریب والدین کی، بیچیاں لے آئیں اور انہیں بڑے ناز اور چاؤ سے پالا پوسا اور جب وہ جوان ہو گئیں تو اُن کی شادی کرادی۔

شیخ نور محمد کو تصوف کا ذوق ورثے میں ملا تھا۔ اس پر بچپن ہی سے اہل دین کی صحبتوں نے اس ذوق کو شوق کی حد تک بڑھا دیا تھا۔ ان پڑھ ہونے کے باوجود وہ تصوف کے معاملات و مسائل سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ اسی بناء پر انھیں ”ان پڑھ فلسفی“ کا خطاب دیا گیا تھا۔ اُن کی عادات و اطوار اور مشاغل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوّل و آخر صوفی تھے اور خوفِ خدا انھیں ہر وقت دامن گیر رہتا تھا۔ ”رموزِ بے خودی“ میں اقبال نے اپنے والد محترم کی خدا ترسی کا حال منظوم انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک بار کسی فقیر نے بھیک مانگنے کے لیے اُن کے دروازے پر صدالگائی اور کچھ لیے بغیر وہاں سے کسی طرح نہ ملا۔ نوجوان اقبال کو اس بات پر سخت غصہ آیا اور انھوں نے اسے دو چار طمانچے رسید کر دیے۔ اس سے فقیر کی جھولی میں کچھ تھا، وہ سب زمین پر گر پڑا۔ اُن کے والد نے یہ منظر دیکھا تو اُن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انھوں نے گلوگیر لہجے میں اپنے بیٹے اقبال سے کہا: ”قیامت کے دن جب رسول کریمؐ کے ارد گرد ساری اُمتِ مسلمہ جمع ہوگی، غازی، شہید، عالم، حافظ، عابد سب موجود ہوں گے اور یہ مظلوم فقیر آقائے نادر کے سامنے تمہارے اس ظلم کی فریاد کرے گا اور آنحضرتؐ مجھ سے پوچھیں گے کہ ہم نے ایک بندہٴ مُسلم کو تیری فرزندگی اور نگہداشت میں دیا، تو اسے بھی آدی نہ بنا سکا۔ تو میں کیا جواب دوں



گا۔ اے نورِ نظر! تو اُسٹِ محمدیؐ کا ایک فرد ہے۔ تجھے اخلاقِ محمدیؐ سے بہرہ ور ہونا چاہیے اور سرِ اِپا شفتِ نورِ حمت بننا چاہیے نہ کہ ظلم و فرعونیت کا نمونہ۔“

اقبال کے دل پر اپنے والدِ محترم کی یہ نصیحت اثر کر گئی، بلکہ اُن کے دل و دماغ پر ایک دائمی نقش چھوڑ گئی۔

شیخ نور محمد کے ہاں دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں۔ بڑے لڑکے کا نام شیخ عطا محمد اور چھوٹے لڑکے کا نام محمد اقبال تھا۔ شیخ عطا محمد نے ابھی میٹرک بھی پاس نہیں کیا تھا کہ اُن کی شادی برٹش انڈین آری کے ایک ریٹائرڈ پشتر سپاہی کی لڑکی سے ہو گئی۔ اُن کے خسر کے اثر و رسوخ کی وجہ سے شیخ عطا محمد کو پہلے فوج میں ”ر سالہ“ میں ملازمت مل گئی۔ پھر بعد میں انہیں اڈ کی کے انجینئرنگ اسکول میں داخلہ مل گیا۔ کورس کی تکمیل کے بعد وہ فوج میں اور سیر بن گئے اور ترقی کرتے کرتے ایس ڈی او بن گئے۔ وہ اپنی ملازمت کے دوران مختلف مقامات پر متعین رہے اور کچھ عرصہ ایم ای ایس، ایبٹ آباد میں بھی گزارا۔ اس ملازمت میں انھوں نے کافی روپیہ بچایا۔ اقبالؒ کی اعلیٰ تعلیم کا خرچہ بھی انھوں نے ہی برداشت کیا۔ اُن کا میلان قادیانیت کی طرف ہو گیا۔ شیخ عطا محمد کے دو فرزند تھے۔ شیخ اعجاز احمد اور شیخ مختار احمد، شیخ عطا محمد کا انتقال ۱۹۴۰ء میں ہوا۔

اقبالؒ کے والد محترم شیخ نور محمد کا انتقال ۱۷ اگست ۱۹۳۰ء کو ہوا۔ والدہ محترمہ امام بی بی ۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو ۸۷ سال کی عمر میں رحلت فرما گئیں۔ وہ اقبالؒ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ اقبال بھی اُن کی بڑی عزت کرتے تھے۔ گرمیوں میں عدالتیں بند ہوتیں تو وہ انھیں ملنے کے لیے سیال کوٹ تشریف لے جاتے۔ وہ بھی اُن کے خط کا بڑی بے تابی سے انتظار کیا کرتیں۔ جب اقبالؒ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے یورپ تشریف لے گئے تو وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اُن کی بہ خیریت وطن واپسی



کے لیے دُعا مانگا کرتیں۔ اقبال نے اپنی شخصیت پر والدہ کے اثرات کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے، اس کا اندازہ اُن کے اُس مرثیے سے ہوتا ہے جو انھوں نے والدہ کی وفات پر لکھا اور بعد میں ”والدہ مرحومہ کی یاد میں“ کے عنوان سے ”بانگ درا“ کے اوراق میں شامل ہوا۔

کس کو اب ہو گا وطن میں آہ میرا انتظار  
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار  
خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا  
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا؟  
تر بیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا  
گھر میرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوا  
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی  
میں تیری خدمت کے قابل جب ہوا، تو چل بسی  
آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے  
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مولانا عبدالمجید سالک جب تعزیت کے لیے علامہ اقبال کے پاس گئے تو وہ دیر تک اپنی والدہ کی خوبیاں بیان کرتے رہے اور ساتھ ساتھ روتے بھی جاتے تھے۔ فرمانے لگے: ”جب میں سیال کوٹ جاتا تھا تو والدہ گفتگو دلی سے فرماتیں: ”میرا بالی آ گیا“، تو میں اُن کے سامنے خود کو ایک ننھا مٹا بچہ محسوس کرنے لگتا۔“

پیدائش اور بچپن

اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء بہ مطابق ۳ ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ کو سیال کوٹ کے

محلے چودھری وہاب میں، جسے آج کل اقبال اسٹریٹ کے نام سے پکارا جاتا ہے، پیدا

ہوئے۔ نومولود کا نام اُس کی والدہ نے ”محمد اقبال“ رکھا۔ اقبال ابھی دو سال کے تھے کہ کسی بیماری میں جو نکمیں لگانے کی ”دوا“ تجویز کی گئی۔ کپٹی پر جو نکمیں لگانے سے داہنی آنکھ سے کافی مقدار میں خون خارج ہو گیا، جس کی وجہ سے داہنی آنکھ کی بصارت ہمیشہ کے لیے جاتی رہی۔ لیکن بائیں آنکھ کی بینائی اس قدر تیز تھی کہ انھیں آخری عمر تک کبھی دائیں آنکھ کی بصارت چلے جانے کا احساس نہ ہوا۔ آخری بیماری میں جب صحت مند بائیں آنکھ میں موتیا اتر آیا تو انھیں اُس وقت محسوس ہوا کہ اُن کی ایک آنکھ پہلے ہی سے ناکارہ ہے۔

ابتدائی تعلیم قدیم اور روایتی طرز کے مکتب میں حاصل کی۔ پہلے انھیں مولانا غلام حسن کے مکتب میں بٹھایا گیا۔ بعد ازاں مولوی میر حسن کے مکتب میں درس لینے کے بعد انہی کے مشورے پر انھیں سیال کوٹ کے سکاچ مشن اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں سے پانچویں جماعت کا امتحان امتیازی حیثیت میں پاس کرنے پر وظیفہ ملا۔ ۱۸۹۱ء میں مڈل اور ۱۸۹۳ء میں میٹرک پاس کیا۔ آپ کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ اسکول میں دیر سے آنے پر ماسٹر صاحب نے باز پرس کی تو اقبال بے ساختہ جواب دیا: ”اقبال دیر ہی میں آتا ہے۔“

ایک دفعہ اقبال اپنے استاد محترم مولوی میر حسن کے گھر کے لیے بازار سے سودا سلف خرید کر واپس آئے تو راستے میں میر حسن صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے اقبال کو دیکھتے ہی کہا: ”تمہیں کتنی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ بازار سے ہمارے لیے سودا سلف نہ لایا کرو۔ تم میرے شاگرد ہو، نوکر نہیں۔“

اس پر اقبال نے مسکرا کر جواب دیا: ”جناب، میں آپ کا شاگرد نوکر ہوں۔“

اقبال نے سکاچ مشن کالج (مرے کالج) سیال کوٹ میں داخلہ لیا۔ یہیں



### پیامبر اقبال

سے ایف اے کیا۔ انھوں نے جس ماحول میں تعلیمی مراحل طے کیے، اُس کی ایک جھلک اقبال کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے:

”جب میں سیال کوٹ میں پڑھتا تھا تو صبح اٹھ کر روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا۔ والد صاحب اپنے اوراد و وظائف سے فرصت پا کر آتے اور مجھے دیکھ کر گزر جاتے۔ ایک صبح وہ میرے پاس سے گزرے تو فرمایا: ”کبھی فرصت ملی تو میں تم کو ایک بات بتاؤں گا۔“ بالآخر انھوں نے ایک مدت کے بعد یہ بات بتائی۔ ایک دن صبح جب میں حسب دستور قرآن کی تلاوت کر رہا تھا تو وہ میرے پاس آئے اور فرمایا: ”بیٹا! کہنا یہ تھا۔ کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھ کر پڑھو کہ یہ قرآن تم پر ہی اُتر رہا ہے، یعنی جیسے اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔“

لاہور میں آمد

اُن دنوں سکاج مشن کالج، سیال کوٹ میں بی اے کی کلاسوں کا اجراء نہیں ہوا تھا (اُس وقت تک وہ مرے کالج کے نام سے منسوب نہیں ہوا تھا)۔ چنانچہ اقبالؒ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے میں داخلہ لے لیا۔ ۱۸۹۷ء میں بی اے کا امتحان سینکڑوں ڈویژن میں پاس کیا اور عربی میں اوّل آنے پر وظیفے کے علاوہ سونے کے دو تھمے بھی حاصل کیے۔ ۱۸۹۷ء میں انھوں نے ایم اے (فلسفہ) میں داخلہ لیا، جہاں انھیں سرنامس آرنلڈ کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ آرنلڈ لاہور آنے سے پہلے علی گڑھ میں دس سال تک فلسفہ پڑھا چکے تھے، اور اس دوران میں انھوں نے مولانا شبلی سے عربی کی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ جب آرنلڈ ہندوستان چھوڑ کر لندن روانہ ہوئے تو اقبال نے ایک نظم ”نالہ فراق“ بہ طور یادگار لکھی، جس کے چند اشعار یہ ہیں۔



ہیاصبر اقبال

جا بسا مغرب میں آخر، اے مکاں تیرا کیس!  
 آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمین  
 کشیدہ عزلت ہوں، آبادی میں گھبراتا ہوں میں  
 شہر سے سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں میں  
 ذرہ میرے دل کا، خورشید آشنا ہونے کو تھا  
 آئینہ ٹوٹا ہوا، عالم نما ہونے کو تھا  
 نخل میری آرزوؤں کا، ہرا ہونے کا تھا  
 آہ! کیا جانے کوئی، میں کیا سے کیا ہونے کو تھا  
 اب کہاں وہ شوق رہ چٹائی صحرائے علم  
 تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم  
 کھول دے گا دستِ وحشت عقدہ تقدیر کو  
 توڑ کر پہنچوں گا، میں پنجاب کی زنجیر کو  
 دیکھتا ہے دیدہ حیراں تری تصویر کو  
 کیا تسلی ہو مگر گرویدہ تقریر کو!  
 ”تاب گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا  
 خامشی کہتے ہیں جس کو، ہے خن تصویر کا

۱۸۹۹ء میں، یعنی سرسید کے انتقال سے ایک برس بعد، اقبال نے ایم اے پاس کیا اور پنجاب یونیورسٹی میں اول آنے پر نواب علی بخش گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اب وہ اورینٹل کالج لاہور میں عربی کے ریڈر مقرر ہوئے۔ تنخواہ ۳ روپے ماہ وار تھی۔ آپ بھائی گیٹ کے قریب رہتے تھے۔ انہی ایام میں علی بخش جیسا جان نثار ملازم ملا، جس نے خدمت کا حق ادا کر دیا۔ بعد ازاں آپ کو گورنمنٹ کالج لاہور میں



فلسفہ کی اسسٹنٹ پروفیسری مل گئی، اور اس کے ساتھ ساتھ آپ انگریزی بھی پڑھانے لگے۔ یہ ملازمت ۲ ستمبر ۱۹۰۵ء تک رہی۔ اس کے بعد آپ نے یورپ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے کالج سے چھٹی لے لی اور یوں پڑھانے کا یہ سلسلہ عارضی طور پر منقطع ہو گیا۔

### شاعری کا آغاز

اقبال نے سیال کوٹ کے سکاچ مشن کالج کی طالب علمی کے زمانے میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے پنجابی میں شعر کہتے رہے۔ پھر مولوی میر حسن کے مشورے پر اردو میں کہنے لگے۔ سیال کوٹ میں ہونے والے اردو مشاعروں میں بھی حصہ لیتے رہے۔ شاعری کی طرف اقبال کے رجحان کے پس منظر میں میر حسن کی ذات نظر آتی ہے۔ جو خود بھی اردو اور فارسی شاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ مولانا میر حسن نے اقبال کو گلستان، بوستان، سکندر نامہ، انوار سیہیلی اور سہ نثر ظہوری کا درس دیا تھا، چنانچہ لڑکپن میں اقبالؒ کے ذہن سے کلام موزوں نکلے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

جب اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا تو اُن کا یہ شوق پہلے سے کہیں زیادہ ترقی کر گیا۔ اب وہ بہ ذریعہ خط و کتابت داغ کے شاگرد بن گئے اور انھیں اپنی غزلیں بہ غرض اصلاح بھیجنے لگے۔ اُن دنوں داغ دہلوی حیدر آباد دکن کے دربار سے منسلک تھے۔ چند غزلوں میں معمولی سی اصلاح کے بعد داغ نے انھیں صاف صاف کہہ دیا کہ اُن کا کلام اصلاح سے بے نیاز ہے۔

داغ دہلوی کے علاوہ اقبالؒ نے لاہور کے ایک ممتاز شاعر ارشد گور گانی سے بھی اصلاح لی۔ علاوہ ازیں اقبال لاہور کے مشاعروں میں باقاعدگی سے حصہ لیتے رہے۔ یہ مشاعرے بازار حکیماس (اندرون بھائی گیٹ) میں ”انجمن مشاعرہ



اتحاد“ کے زیرِ اہتمام منعقد ہوتے تھے۔ اُن کے اس شعر نے پہلی مرتبہ مشاعرے کے سامعین کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔

موتی سمجھ کے شانِ کریبی نے چُن لیے  
قطرے جو تھے مرے عرقِ افعال کے

ایک اور مشاعرے میں اقبال کا کلام سُن کر مولانا شبلی نعمانی نے کہا: ”جب آزاد اور حالی کی کریاں خالی ہوں گی تو لوگ اقبال کو ڈھونڈیں گے۔“ اقبال کے پیام کو عوام تک پہنچانے میں ”انجمنِ حمایتِ اسلام“ کا بھی بڑا حصہ ہے۔ انجمن ہی کے پلیٹ فارم سے اقبال نے اپنی پہلی نظم ”نالہٴ یتیم“ سنائی تھی جس سے حاضرین ششدر رہ گئے تھے۔

### یورپ کا سفر

یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خیال علامہ اقبالؒ کے ذہن میں کس طرح آیا؟ اس سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔ دراصل کئی عوامل مل کر فیصلہ گُن ثابت ہوئے۔ ایک واقعہ تو اُن کا ”ایکسٹرا اسٹنٹ کشنر“ کے لیے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنا تھا۔ یہ امتحان ۱۹۰۱ء میں ہوا تھا۔ اُمید تھی کہ اقبال اس میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہو جائیں گے، لیکن میڈیکل بورڈ نے دائیں آنکھ کے پیدائشی نقص کی بنیاد پر ”غیر موزوں“ قرار دے دیا۔ اس کھلی دھاندلی پر خوب شور مچا۔ منشی محمد دین فوق اور منشی محبوب عالم (مدیر ”پیہ اخبار“) نے بہت احتجاج کیا، لیکن حکومت کے کان پر جوں تک نہ رنگی۔ شاید اسی واقعے سے دل برداشتہ ہو کر اقبال نے یورپ جانے کا فیصلہ کیا۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کو قانون کی تعلیم حاصل کرنے سے خاصی دل چسپی تھی۔ لاہور کے ”لاء سکول“ سے آپ نے دکالت کا امتحان پاس



کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن قانونی پیچیدگیاں حائل ہو گئیں۔ جب آپ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد پر حکومت کے بعض افسروں نے جھوٹا مقدمہ چلایا، تو آپ کا یہ احساس اور بھی شدت اختیار کر گیا ہو گا کہ انھیں قانون کی تعلیم ضرور حاصل کرنی چاہیے۔

یورپ جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش اپنے محبوب استاد سر ٹامس آرنلڈ کے لندن واپس چلے جانے سے اور بھی زیادہ شدید ہو گئی تھی۔ غالباً انھوں نے بھی اپنے لائق شاگرد کو انگلستان آنے کی دعوت دی ہو گی۔ اُس وقت تک آپ نے اپنی ملازمت سے کچھ رقم پس انداز کر لی تھی، لیکن بیش تر اخراجات آپ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے برداشت کیے۔ اقبال نے ملازمت سے ”بغیر تنخواہ“ طویل چھٹی لی۔ اُس وقت شیخ عطا محمد ایم ای ایس ایبٹ آباد میں ملازم تھے۔ چناں چہ جب یورپ جانے کے لیے تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو اقبال اپنے بھائی سے ملنے کے لیے ایبٹ آباد گئے۔ ایبٹ آباد میں شام کے وقت آپ باغ کی سیر کو نکلے، جہاں اب میونسپل کمیٹی کا دفتر ہے۔ اُس کے سامنے کھڑے ہو کر کوہ سربن سے اٹھنے والی گھٹا اور پل بھر میں بارش برسنے کا دل فریب منظر دیکھا اور اس سے متاثر ہو کر نظم ”ابر“ لکھی جو ”بانگ درا“ میں شامل ہے۔

انہی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا  
سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا  
گرج کا شور نہیں ہے، خوش ہے یہ گھٹا  
عجیب میکدہ بے خروش ہے یہ گھٹا  
جو پھول مہر کی گرمی سے سوچے تھے، اٹھے  
زمین کی گود میں جو پڑ کے سو رہے تھے، اٹھے



بیاض اقبال

ہوا کے زور سے ابھرا، بڑھا، اڑا بادل  
 ابھی، وہ اور گھٹا، لو! برس پڑا بادل  
 ایک دو دن ایبٹ آباد میں قیام کے بعد واپس لاہور آ گئے۔ پھر دہلی گئے۔  
 وہاں خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار پر گئے اور ”التجائے مسافر“ کے عنوان سے اپنا  
 الوداعی سلام پیش کیا۔ امیر خسرو اور غالب کے مزار پر بھی حاضری دی۔ ”التجائے  
 مسافر“ کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے  
 شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو  
 مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے  
 کسی سے شکوہ نہ ہو، زیرِ آسمان مجھ کو  
 دلوں کو چاک کرے مثلِ شانہ جس کا اثر  
 تری جناب سے ایسی لمبے نفاں مجھ کو  
 پھر آ رکھوں قدمِ مادر و پدر پر جہیں  
 کیا جنھوں نے محبت کا راز داں مجھ کو  
 وہ میرا یوسفِ ثانی، وہ شمعِ محفلِ عشق  
 ہوئی ہے جس کی اخوت، قرابِ جاں مجھ کو  
 شگفتہ ہو کے کلیِ دل کی پھول ہو جائے  
 یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

اس دُعا میں اقبال کے آئندہ ذہنی سفر کی منزلوں کے نشان صاف طور پر  
 دکھائی دے رہے ہیں۔ ”یوسفِ ثانی“ اپنے بھائی شیخ عطا محمد کی طرف اشارہ ہے،  
 جنھوں نے چھوٹے بھائی کا مستقبل بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔



## اقبال یورپ میں

انگلستان پہنچنے کے بعد اقبال نے اپنے استاد آرنلڈ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ اُن کا قیام کسی ایسے گھر میں کر دیا جائے، جہاں ذبیحہ کا خاص انتظام ہو۔ یورپ میں یہودیوں کے ہاں ہی اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک یہودی عورت کے ہاں جس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی، قیام کیا۔ اس عورت کے ہاں قیام کے دوران اُن کی یہ عادت تھی کہ وہ رفع حاجت کے لیے لوٹا ساتھ لے جاتے تھے۔ مالک مکان نے ایک دن پوچھا کہ تم غسل خانے میں لوٹا کیوں ساتھ لے جاتے ہو۔ آپ نے فرمایا: ”اسلامی طہارت کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ قضائے حاجت کے بعد صرف کاغذ یا مٹی کے ڈھیلے کا استعمال کافی نہیں، بلکہ پانی سے استنجا کرنا بھی ضروری ہے۔“

اس سلسلے میں مزید گفتگو کے دوران انہوں نے طہارت کے اسلامی اصول بیان کیے۔ مثلاً انہوں نے بتایا کہ غسل جنابت مسلمان مرد اور عورت پر اس طرح فرض ہے جس طرح عورت پر طہر کا غسل۔ پھر آپ نے اُس عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”بڑی بی، آپ کو اس طرح کے کسی غسل کی حاجت نہ ہوگی، البتہ طہارت کے لیے پانی ضرور استعمال کیجیے۔“

یہ باتیں سُن کر بڑی بی بہت خوش ہوئیں اور اسلامی قاعدے سے طہارت کرنے کا وعدہ کر لیا۔

۱۹۰۵ء میں اقبال نے کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرنٹی کالج میں داخلہ لے لیا۔ اسی کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد لندن کے لاء کالج ”لنکن ان“ میں قانون کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اسی دوران میں آپ نے میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کے لیے ”فلسفہ عجم“ پر مقالہ لکھنے کا آغاز کر دیا۔ آپ نے



### بیامبر اقبال

اپنا مقالہ انگریزی میں لکھا۔ ۲۸ اگست ۱۹۰۷ء کو میونخ پہنچے۔ وہاں پروفیسر ران کی حسین اور طرح دار بیٹی اُن کی معلم اور اتالیق رہی۔ ۳۰ اگست کو آپ ہائیڈرل برگ میں مقیم ہو گئے۔ (چنانچہ اب وہاں ایک تختی نصب کی گئی ہے جس میں اقبال کا نام اور اُن کے قیام کی تاریخیں درج ہے) ۴ نومبر ۱۹۰۷ء کو میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد دوبارہ لندن واپس آئے اور ”لنکن ان“ سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ اس کے علاوہ معاشیات اور سیاسیات کے مطالعے کے لیے ”لندن سکول آف اکنامکس“ میں داخلہ لیا اور کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ اخلاق کے موضوع پر مقالہ لکھ کر ڈگری بھی حاصل کی۔

قیام یورپ کا زمانہ اقبال کی ذہنی نشوونما میں ایک نہایت اہم دور قرار دیا جاسکتا ہے، کیوں کہ اس دور میں اقبال کے تخیلات میں بڑی اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں اور انہوں نے اپنے لیے ایک منزل کا تعین کیا۔ اس ضمن میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ انگلستان کی مادی خوش حالی سے پیدا ہونے والی لادینی اور بے راہ روی نے اقبال پر الٹا اثر کیا اور یوں اسلامی تعلیمات و معاملات اور شعائر میں اُن کا شغف پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا۔ قیام یورپ کے زمانے کی جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں، اُس کے لیے ہم اقبال کی ایک خاتون، دانش ور دوست بیگم عطیہ فیضی کے مرہون منت ہیں، جن کے ساتھ علامہ کی انگلستان اور جرمنی میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ اقبال کی دعوت پر وہ کچھ عرصہ جرمنی میں بھی رہیں اور پھر واپس ہندوستان لوٹ آئیں۔

مئی ۱۹۰۸ء میں لندن کے کنگسٹن ہال میں جسٹس سید امیر علی کے زیر صدارت مسلمانانِ لندن کا اجلاس ہوا، جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی لندن کی شاخ کا افتتاح ہوا۔ سید امیر علی صدر اور اقبال مجلسِ عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔



اقبال نے کیمبرج یونیورسٹی میں اسلام اور اسلامی فلسفے پر نصف درجن مقالات لکھے۔ ”پان اسلامک سوسائٹی“ کی تنظیم میں حصہ لیا۔ انگلستان، اسکاٹ لینڈ اور جرمنی کے مختلف علاقوں کے دورے کیے۔ لندن میں اسلام پر کئی لیکچر دیے۔ پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھنے کے دوران عجمی تصوف کا تحقیقی مطالعہ کیا، جس سے نظریہ وحدت الوجود کا طلسم پاش پاش ہو گیا۔ وطنیت کا جو تصور یورپی اقوام میں رائج تھا، اقبال نے اُس کا بھی بہ غور مشاہدہ کیا اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ وطنیت خود ایک بُت ہے اور اسے توڑنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

قیامِ یورپ کے دوران میں عملی جدوجہد کی برکتیں کچھ اس طرح روشن ہوئیں کہ اقبال نے شاعری کو ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن شیخ عبدالقادر اور سر آرنلڈ کے اصرار پر یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں جو دوسری اہم تبدیلی واقع ہوئی وہ فارسی کو اپنے اظہار کے لیے برتنا تھا۔ اب اقبال نے زیادہ تر فارسی ہی کو اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ قیامِ یورپ کے آخری ایام میں پروفیسر آرنلڈ کی رخصت کے دوران چھ ماہ تک لندن میں عربی کے پروفیسر رہے اور تین برس کے قیام کے بعد متحدہ ڈگریوں کے ساتھ واپس وطن لوٹے۔

### یورپ سے واپسی

یورپ سے واپسی کے بعد اقبال پہلے بمبئی میں اپنے دوستوں سے ملے۔ اس کے بعد انہوں نے دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیاء، امیر خسرو اور غالب کے مزار پر دوبارہ حاضری دی اور انبالہ میں احباب کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء بروز دوشنبہ، دوپہر کی ریل گاڑی سے لاہور پہنچے۔ دوست اور عقیدت مند اپنی معیت میں بھائی دروازے لے گئے، جہاں باغ میں شامیانے نصب کر کے چائے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس تقریب سے فارغ ہو کر آپ اُسی دن سیال



کوٹ اپنے والدین سے ملنے چلے گئے۔

تین چار روز کے بعد اقبالؒ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد لاہور آئے اور مرزا جلال الدین بیرسٹر کے ذمے ایک دفتر کرایے پر لینے کا کام سونپ گئے۔ چنانچہ مرزا صاحب نے موہن لال روڈ (اردو بازار) پر نشی گلاب سنگھ کے مطبع مفید عام کے سامنے ایک مکان کرایے پر لیا۔ بڑے بھائی اور بعض احباب کا اصرار یہ تھا کہ اقبال ضلع پکھری میں وکالت کریں، لیکن خود اقبال نے چیف کورٹ میں پریکٹس کرنے کو ترجیح دی۔ چنانچہ دو تین ماہ کے بعد انہوں نے یہ مکان چھوڑ کر انارکلی بازار کا وہ بالا خانہ کرایے پر حاصل کر لیا، جس میں اس سے پہلے سر محمد شفیع بھی کافی عرصے تک قیام کر چکے تھے۔ اسی مکان میں دفتر بھی تھا اور سکونت بھی۔

وکالت کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کالج میں ڈیڑھ سال تک ایم اے کی کلاسوں کو فلسفہ اور بی اے کی کلاسوں کو انگریزی پڑھاتے رہے۔ وکالت کے زمانے میں علامہ اقبال کے نشی ”نشی طاہر الدین“ تھے (یہ وہی صاحب ہیں جن کی ایجاد کردہ دوا ”دل روز“ کافی مقبول ہوئی۔) بہ حیثیت وکیل اقبال نے ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۳۴ء تک کام کیا۔ اُن کی دوسری دلچسپیاں کچھ ایسی تھیں کہ وہ اپنی پوری توجہ قانون کے پیشے کو نہ دے سکے۔ چنانچہ اس میں کوئی خاص شہرت حاصل نہ کر سکے۔

۱۹۱۷ء میں سر اکبر حیدری نے قانون کی پروفیسری کے لیے حیدر آباد آنے کی دعوت دی اور لکھا کہ آپ کو پرائیویٹ پریکٹس کی اجازت ہوگی، لیکن آپ نے یہ ملازمت قبول نہ کی۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے بھی آپ کو پروفیسری کی پیش کش کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی تاریخ کی پروفیسری کی پیشکش ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں بحیثیت پرنسپل تقرری کی تجویز پیش ہوئی۔ لیکن آپ نے یہ



ہیامبر اقبال

تمام ملازمتیں قبول نہیں کیں۔ وجہ یہ تھی کہ اقبال اظہارِ رائے کی آزادی کو کسی بھی قیمت پر قربان کرنا نہیں چاہتے تھے۔ زندگی کو اپنے نصب العین کی روشنی میں ایک خاص ڈھب سے گزارنے کے لیے انہوں نے چند اصول بنائے ہوئے تھے، جن پر عمل کرنے کو وہ ہر چیز پر مقدم سمجھتے تھے۔

### دوسری گول میز کانفرنس

حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان کے آئینی مسائل کے حل کے لیے دوسری گول میز کانفرنس کا اعلان کیا جو دسمبر ۱۹۳۱ء میں لندن میں منعقد ہونے والی تھی۔ اس میں شرکت کے لیے مولانا شوکت علی، مولانا شفیع داؤدی، سر آغا خان، محمد علی جناح اور علامہ اقبال کو بھی مدعو کیا گیا۔ انہی ایام میں علامہ اقبال کو مزید دو دعوتیں موصول ہوئیں۔ پہلی دعوت روم اکیڈمی کی طرف سے تھی۔ مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی نے عالم اسلام کے اتحاد کا ایک جامع منصوبہ بنایا اور تمام اسلامی ممالک کے نمائندوں کو بیت المقدس آ کر تبادلہ خیال کی دعوت دی۔ علامہ اقبال کو بھی شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا۔

علامہ اقبال ۸ اگست ۱۹۳۱ء کو لاہور سے روانہ ہوئے اور دوسرے دن دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے جہاں کوئی تین ہزار افراد آپ کے انتظار میں جمع تھے۔ جوں ہی گاڑی رُکی اور آپ اپنے ڈبے سے باہر نکلے، ہجوم نے نعرہٴ تکبیر بلند کیا اور پھولوں کی بارش شروع کر دی۔ آپ نے مختصر سا خطاب کرتے ہوئے کہا: ”میرے ساتھ نہ تو کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے اور نہ سیاسی لٹریچر کا پلندہ جس پر اپنے دلائل کی اساس قائم کروں۔ میرے ساتھ حق و صداقت کی ایک جامع کتاب ”قرآن مجید“ ہے، جس کی روشنی میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش کروں گا۔“





۲۰ / اگست کو پورٹ سعید پہنچے۔ عدن کی بندرگاہ پر ساحل عرب کو دیکھ کر آپ پر عجیب و غریب جذباتی کیفیت طاری ہو گئی اور سر زمین عرب کو مخاطب کرتے ہوئے وہ یوں گویا ہوئے:

”اے عرب کی مقدس سر زمین، تجھ کو مبارک ہو۔ تو ایک پھر تھی جس کو دنیا کے معماروں نے رد کر دیا تھا، مگر ایک یتیم بچے نے خدا جانے تجھ پر کیا جادو کیا کہ موجودہ دنیا کی تہذیب و تمدن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی..... تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدس نقش قدم دیکھے ہیں۔ کاش میرے بد کردار جسم کی خاک تیرے ریت کے ذروں میں مل کر تیرے بیابانوں میں اڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دنوں کا کفارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لٹ جاؤں اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہوا اُس پاک سر زمین میں جاسکوں، جس کی گلیوں میں اذانِ بلائ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔“

۲۷ / اگست ۱۹۳۱ء کو اقبال انگلستان پہنچے اور اپنے سات سالہ فرزند جاوید اقبال کو بہ ذریعہ تاریخیت سے لندن پہنچنے کی اطلاع بھیجی۔ اس اثنا میں مولانا غلام رسول مہر یورپ ہوتے ہوئے انگلستان پہنچ گئے۔ ۱۸ نومبر کو لندن کی ”اقبال لٹرییری ایسوسی ایشن“ نے علامہ اقبال کے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیا، جس میں ہندوستان اور انگلستان کی منتخب علمی و سیاسی شخصیتوں نے شرکت کی۔ لفظ پاکستان کے خالق چودھری رحمت علی بھی شریکِ محفل تھے۔ اقبال کی تصنیف ”اسرارِ خودی“ کے انگریز مترجم اور علامہ اقبال کو یورپ کے ادبی حلقوں میں متعارف کرانے والے پروفیسر نکلسن بھی موجود تھے۔ سرجنی نائیڈو بھی حاضر تھیں۔ صدارت کے فرائض سر شیخ عبدالقادر نے انجام دیے۔



گول میز کانفرنس کے دوران لندن میں اقبال کو اپنے فرزند جاوید اقبال کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط موصول ہوا، جس میں انہوں نے اپنے والد سے گراموفون لانے کی فرمائش کی تھی۔ گراموفون تو خیر وہ نہ لائے، البتہ خط کے جواب میں ایک غزل لکھ کر بھیج دی:

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر  
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر  
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو  
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر  
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں  
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر  
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر  
مرے ثمر سے مئے لالہ و فام پیدا کر  
میرا طریقِ امیری نہیں، فقیری ہے  
خودی نہ بیچ، غریبی میں نام پیدا کر

انگلستان سے واپسی میں اٹلی کی حکومت کی دعوت پر روم گئے۔ مولانا غلام رسول مہر علامہ صاحب کے ساتھ تھے۔ معلوم ہوا کہ بادشاہِ امان اللہ خان غازی بھی روم میں مقیم ہیں۔ چنانچہ کوئی تین گھنٹے تک ملاقات ہوئی۔ جس میں انگلستان اور عالمِ اسلام کا مستقبل خاص طور پر زیرِ بحث رہا۔

۲۷ نومبر کو موسولینی کی خواہش پر علامہ صاحب نے اُس سے ملاقات کی۔ رسمی مزاج پُرسی کے بعد موسولینی نے علامہ صاحب سے پوچھا: ”میری فاشٹ تحریک کے

بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

علامہ اقبال نے جواب دیا: ”آپ نے ڈسپلن کے اصول کا بڑا حصہ اپنایا ہے جسے اسلام اسلامی نظام حیات کے لیے بہت ضروری سمجھتا ہے، لیکن اگر آپ اسلام کا نظریہ حیات پوری طرح اپنالیں تو سارا یورپ آپ کے تابع ہو سکتا ہے۔“

مسوئینی نے علامہ صاحب سے اٹلی کے قیام کے بارے میں اُن کے تاثرات پوچھے۔ آپ نے فرمایا: ”میں اطالویوں کے متعلق سمجھتا ہوں کہ وہ ایرانیوں سے کافی مشابہت رکھتے ہیں اور بڑے ذہین و فطین، خوبصورت اور فن پرست ہیں۔ ان کے پیچھے تمدن کی کتنی ہی صدیاں ہیں، مگر ان میں خون نہیں۔“

مسوئینی نے اس پر حیرت کا اظہار کیا تو آپ نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ”ایرانیوں کو ایک فائدہ میسر رہا ہے جو اطالویوں کو میسر نہیں، اور وہ یہ کہ ان کے ارد گرد مضبوط اور توانا قومیں افغان، گُرد اور ترک آباد ہیں جن سے وہ تازہ خون حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ اطالوی ایسا نہیں کر سکتے۔“

اس پر مسوئینی نے پوچھا: ”اچھا ہم اہل اٹلی کو کیا کرنا چاہیے؟“

علامہ صاحب نے جواب دیا: ”یورپ کی تقلید سے منہ موڑ کر مشرق کا رخ کرو۔ اس لیے کہ یورپ کا اخلاق ٹھیک نہیں۔ مشرق کی ہوا تازہ ہے، اس میں سانس لو۔“

مسوئینی نے علامہ اقبال سے کوئی اچھوتا مشورہ طلب کیا جو خاص اٹلی کے حالات کے لیے موزوں ہو۔ انہوں نے فرمایا: ”ہر شہر کی آبادی مقرر کر کے اُسے ایک خاص حد سے آگے بڑھنے نہ دو۔ اس سے زیادہ آبادی کے لیے نئی بستیاں مہیا کی جائیں۔“

مسوئینی نے اس کی وجہ پوچھی تو علامہ صاحب نے فرمایا: ”شہر کی آبادی جس



قدر بڑھتی جاتی ہے، اُس کی تہذیبی و اقتصادی توانائی بھی کم ہوتی ہے اور ثقافتی توانائی کی جگہ محزکات شری لیتے ہیں۔“

علامہ اقبال نے مزید کہا: ”یہ میرا ذاتی نظریہ نہیں ہے بلکہ میرے رسولؐ نے تیرہ سو سال پہلے یہ مصلحت آمیز ہدایت جاری فرمائی تھی کہ جب مدینہ منورہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کر جائے تو مزید لوگوں کو آباد ہونے کی اجازت دینے کی بجائے دوسرا شہر آباد کیا جائے۔“

یہ حدیث سنتے ہی موسیٰ گری سے اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھ میز پر زور سے مارتے ہوئے کہنے لگا: ”کتنا خوب صورت خیال ہے؟“

علامہ صاحب نے ”موسیٰ“ کے عنوان سے ایک نظم بھی لکھی تھی، جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب  
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب  
چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ  
نوجواں تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب  
یہ محبت کی حرارت! یہ تمنا، یہ نمود!  
فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب  
نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے  
زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب  
فیض یہ کس کی نظر کا ہے؟ کرامت کس کی ہے؟  
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب۔

بیامبر اقبال

اس ملاقات کے کچھ عرصہ بعد جب موسیقی نے حبشہ پر چڑھائی کر دی تو آپ نے موسیقی کی جوع الارض کی حرص کی سخت مذمت کی۔ ۱۸ اگست ۱۹۳۵ء کو ایک نظم ”ابی سینیا“ کے عنوان سے لکھی۔

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر  
ہے کتنی زہر ناک ابی سینیا کی لاش  
ہونے کو ہے یہ مردہ دیرینہ قاش قاش  
تہذیب کا کمال، شرافت کا ہے زوال  
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش  
ہر گرگ کو ہے بڑا معصوم کی تلاش  
اے دوائے آبروئے کلیسا کا آئینہ  
روما نے کر دیا سر بازار پاش پاش

چیر کلیسیا! یہ حقیقت ہے دل خراش!  
ایک دفعہ کسی نے علامہ اقبال کو لکھا کہ آپ نے موسیقی کے متعلق دو نظمیں لکھی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس پر آپ نے مختصر سا جواب دیا: ”اگر اُس بندہ خدا میں رحمانی اور شیطانی دونوں صفات موجود ہیں تو اس کا میرے پاس کیا علاج ہے؟“

ایک روز علامہ اقبال اٹلی کے دورانِ قیام میں مولانا غلام رسول مہر کی معیت میں کولوسیم کے آثارِ قدیمہ دیکھنے لے لیے گئے۔ ایک ماہر نے بتایا کہ روم کے ان اکھاڑوں میں پچاس ہزار آدمی بہ یک وقت تماشا دیکھ سکتے تھے۔ واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچنے کے بعد مہر صاحب سے کہنے لگے: ”ایک طرف قدیم رومی شہنشاہ تھے



بیاضبر اقبال

جنہوں نے ایک عظیم الشان عمارت اس غرض کے لیے بنائی کہ پچاس ہزار انسان بیٹھ کر انسانوں اور درندوں کی لڑائی کا تماشا دیکھ سکیں۔ دوسری طرف لاہور کی بادشاہی مسجد ہے جو اس غرض سے تعمیر کی گئی ہے کہ ایک لاکھ بندگانِ خدا جمع ہو کر مساوات، اخوت اور محبت کے سچے اور مخلصانہ جذبات کا مظاہرہ کر سکیں۔ اس ایک مثال کو سامنے رکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام کتنی برکات کا سرچشمہ ہے۔“

۲۸ نومبر کو آپ نے نیپلز کے کھنڈروں کی سیر کی اور عجائب گھر دیکھا۔  
۲۰ نومبر کو مصر کے لیے روانہ ہو گئے۔

### اقبال مصر میں

قاہرہ میں آپ کی رہائش کا انتظام میٹروپولیٹن ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر عبد الحمید سعید بے نے رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ اس موقع پر مصری اخبار نویسوں نے آپ کو مجبور کر دیا کہ وہ مصری نوجوانوں کی تنظیم ”شبان مصر“ کے نام کوئی مختصر پیغام ضرور جاری کریں۔ چنانچہ آپ نے ایک کاغذ پر اپنا یہ پیغام لکھ دیا: ”مصر کے نوجوانوں سے میری درخواست ہے کہ وہ رسولِ کریمؐ کے وفادار رہیں

ایک روز مصر کی بزرگ شخصیت سید محمد قاضی ابوالعزائم اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ علامہ سے ملنے کے لیے تشریف لائے۔ علامہ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ”آپ نے کیوں تکلیف کی۔ میں خود آپ کی زیارت کے لیے آپ کے پاس چل کر آتا۔“

فرمانے لگے: ”خواجہ دو جہاں آغزور کا ارشاد ہے، کہ جس نے دین سے تمسک حاصل کیا ہو، اُس کی زیارت کو جاؤ گے تو مجھے خوشی ہو گی۔“

یہ بات سن کر علامہ بے تاب ہو گئے اور اُن کے رخصت ہونے کے بعد روتے ہوئے فرمانے لگے: ”کیا زمانہ آ گیا ہے کہ لوگ مجھ جیسے گناہ گار کو متمسک بالدین سمجھ کر آنحضورؐ کے ارشاد کے اتباع میں بہ غرض خوشنودی رسولؐ ملنے آئے ہیں۔“

مصر میں آپ کی ملاقات مشہور صحافی اور تاریخ داں ڈاکٹر محمد حسین ہیکل سے بھی ہوئی۔ ۴ دسمبر کی شام کو آپ نے ”شان المسلمین“ سے انگریزی میں خطاب کیا۔ اگلے روز مسجد عمرو بن العاصؓ پہنچے۔ امام شافعیؒ کے مزار پر آپ دیر تک قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہے۔ جامعہ ازہر پہنچے اور کچھ دیر منطق، تفسیر اور حدیث کے درس میں شریک رہے۔

## اقبال فلسطین میں

۶ دسمبر کو یہ حضرات بیت المقدس پہنچے۔ استقبال کے لیے خود مفتی اعظم امین الحسینی تشریف لائے۔ مؤثر عالم الاسلامی کے افتتاحی اجلاس میں دنیا کے ہر اسلامی ملک سے نمائندے شریک تھے۔ اجلاس کے بعد تمام شرکاء مسجد اقصیٰ کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں آپ نے رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ پھر مسجد اقصیٰ پہنچ کر نماز مغرب ادا کی گئی۔ نماز عشا کے بعد مفتی اعظم نے اپنا خطبہ پڑھا۔ اُن کے بعد اقبال نے تقریر کی۔ دوسرے اجلاس میں عہدہ داروں کا انتخاب ہوا۔ مفتی اعظم اتفاق رائے سے صدر منتخب ہوئے۔ چار نائب صدر منتخب کیے گئے جن میں علامہ اقبال بھی شامل تھے۔ اقبال نے بعد میں ”فلسطینی عرب سے“ خطاب کرتے ہوئے ایک مختصر نظم بھی لکھی۔

زمانہ اب بھی نہیں، جس کے سوز سے فارغ

میں جانتا ہوں، وہ آتش ترے وجود میں ہے



تری دوا نہ جینوا میں ہے ، نہ لندن میں  
فرنگ کی رگ جاں بختِ یہود میں ہے  
منا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات  
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے !

## تیسری گول میز کانفرنس

جب دوسری گول میز کانفرنس بھی ہندوستان کے آئینی مسائل حل نہ کر سکی تو حکومت انگلستان نے تیسری گول میز کانفرنس کا اہتمام کیا۔ یہ کانفرنس ۱۷ نومبر ۱۹۳۲ء کو شروع ہوئی اور ۲۴ دسمبر کو ختم ہوئی۔ علامہ اقبال نے اس کانفرنس میں شرکت کے علاوہ نیولین کے مزار پر حاضری دی، مشہور محقق میگ نون سے ملاقات کی، جس نے دلائل سے ثابت کیا تھا کہ دانستے کی تصنیف ”طربہ خدانوی“ Divine Comedy اسلامی روایات و حکایات سے ماخوذ ہے۔ پھر مشہور فلسفی برگساں سے بھی طویل ملاقات کی اور اُس کے نظریہ زمان پر بحث کی، جسے علامہ صاحب اسلامی تصور کے بہت قریب سمجھتے تھے۔ علامہ اقبال نے نیولین پر یہ نظم لکھی، اس کے اشعار یہ ہیں۔

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تنگ و تاز  
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز  
جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع  
کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز  
جوشِ کردار سے تیور کا سیل ہمہ گیر  
سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز  
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر  
جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز





پیامبر اقبال

ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس  
عوض یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز ۱

پروفیسر برگساں سے ملاقات کے دوران جب علامہ اقبال نے برگساں کو اسلامی تصورِ زماں کے سلسلے میں آنحضورؐ کی یہ حدیث سنائی: ”زمانہ کو بُرا مت کہو کہ زمانہ خود خدا ہے“ تو یہ حدیث سنتے ہی برگساں ششدر رہ گیا اور گُرسی سے اچھل کر آگے بڑھا اور اقبال سے پوچھنے لگا ”کیا یہ واقعی حدیث ہے؟“

### مسجدِ قرطبہ

اسپین کے سفر کے دوران جو چیز علامہ اقبال کے لیے سب سے زیادہ دل چسپی کا باعث بنی، وہ مسجدِ قرطبہ تھی جو مسلمانوں کے اسپین میں سات سو سالہ دورِ حکومت کی گواہ کے طور پر موجود تھی اور بڑی شان سے ایستادہ تھی۔ اس مسجد کو گر جا گھر میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اقبال نہ صرف اس مسجد کو دیکھنا چاہتے تھے بلکہ یہاں نماز بھی پڑھنا چاہتے تھے، لیکن رکاوٹ یہ تھی کہ اسپین کے قانون کے مطابق اس مسجد میں اذان دینا اور نماز پڑھنا ممنوع تھا۔ پروفیسر آرنلڈ کی کوشش سے اقبال کو اس شرط کے ساتھ مسجد میں نماز ادا کرنے کی اجازت دے دی گئی کہ وہ مسجد کے اندر داخل ہوتے ہی اندر سے دروازہ مقفل کر دیں۔

مسجد میں داخل ہوتے ہی اقبال نے اپنی آواز کی پوری قوت کے ساتھ اذان دی ”اللہ اکبر، اللہ اکبر۔“ سات سو سال کے طویل عرصے میں یہ پہلی اذان تھی جو مسجد کے در دیوار سے بلند ہوئی۔ اذان کے فارغ ہونے کے بعد اقبال نے مصلیٰ بچھایا اور دو رکعت نماز ادا کی۔ نماز میں آپ پر اس قدر رقت طاری ہو گئی کہ گریہ وزاری برداشت نہ کر سکے اور سجدے کی حالت میں بے ہوش ہو گئے۔ جب آپ



بیامبر اقبال

ہوش میں آئے تو آنکھوں سے آنسو نکل کہ رُخساروں پر سے بہہ رہے تھے اور سکونِ قلب حاصل ہو چکا تھا۔ جب آپ نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو یکایک اشعار کا نزول ہونے لگا، حتیٰ کہ پوری دُعا اشعار کی صورت میں مانگی۔ اس دُعا کے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو  
میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو  
راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق  
ساتھ مرے رہ گئی، ایک مری آرزو  
تجھ سے گریباں مرا مطلع صبحِ نشور  
تجھ سے مرے سینے میں آتشِ اللہ ہو  
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ  
تو ہی میری آرزو، تو ہی میری جہتو  
پھر وہ شراب کہن مجھ کو عطا کر، کہ میں  
ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سُبُو!  
تری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ  
اپنے لیے لامکاں میرے لیے چار سو!  
فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا؟  
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں رو برو!

علامہ اقبال مسجد قرطبہ کی شان و شوکت سے بڑے متاثر ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانِ ہسپانیہ کے شان دار ماضی کے پس منظر میں ”مسجد قرطبہ“ کے

۱۔ ”دُعا، مسجد قرطبہ میں لکھی گئی“ (بالِ جبریل ..... ۲۰۸)

پیامبر اقبال

عنوان سے ایک طویل نظم لکھی، جو علامہ کے نظریہ حیات اور فن شعر کا شاہ کار ہے

سلسلہ روز و شب، نقشِ گرِ حادثات

سلسلہ روز و شب، اصلِ حیات و ممات

اسپین کے مشہور دریا واداکبیر کے کنارے بیٹھ کر اقبال نے مسلمانوں کی

نشأتِ ثانیہ کا خواب دیکھتے ہوئے لکھا۔

آپ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی !

دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب !

عالمِ نو ہے ابھی پردہٴ تقدیر میں !

میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

پردہ اٹھا دوں اگر چہرہٴ افکار سے

لانہ سکے گا فرنگِ میری نواؤں کی تاب

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی

روحِ امم کی حیات، کشمکشِ انقلاب

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم

کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

نقش ہیں سب ناقص، خونِ جگر کے بغیر

نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر۔

اسپین کے سفر کے بعد علامہ ۲۲ فروری ۱۹۳۳ء کو واپس وطن پہنچ گئے۔

اکتوبر میں سر اس مسعود اور سید سلیمان ندوی کی معیت میں تدوینِ نصاب کے سلسلے



میں حکومت افغانستان کی دعوت پر بہ راہ خیبر کابل گئے اور بہ راہ غزنی وقتدھار واپس آئے۔ اسی سال دسمبر ۱۹۳۳ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اور اس سے اگلے سال علی گڑھ یونیورسٹی نے آپ کو ڈی لٹ (ڈاکٹر آف لٹریچر) کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

نادر شاہ والی افغانستان کو قرآن مجید کا ایک نسخہ پیش کرتے ہوئے، اقبال نے شاہ کو مخاطب ہو کر فرمایا: ”اہل حق کی یہی دولت ہے۔ اسی کے باطن میں حیاتِ مطلق کے چشمے بہتے ہیں۔ یہ ہر ابتدا کی انتہا اور ہر آغاز کی تکمیل ہے۔ اسی کی بدولت مومن خیبر شکن بنتا ہے۔ میرے کلام میں تاثیر اور میرے دل کا سوز و گداز سب اسی کا فیضان ہے۔“

سفر افغانستان کے علاوہ اندرون ملک بھی کئی شہروں کے دورے کئے۔ متعدد بار بھوپال گئے۔ حیدرآباد دکن گئے۔ علی گڑھ، کشمیر اور پانی پت گئے۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں ”مدرسہ مسلم ایوسی ایشن“ کی دعوت پر مدراس گئے جہاں آپ کا قیام تین یوم تک رہا۔ مدراس میں آپ نے تین لیکچر دیئے۔ باقی تین لیکچر حیدرآباد میں دیئے۔ یہ چھ لیکچر انگریزی میں تھے۔ بعد میں ”تشکیل جدید الہیات“ کے عنوان کی کتابی صورت میں چھپے اور اردو میں ترجمہ ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں سرہند کا سفر کیا اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار پر حاضری دی۔ اس سفر میں آپ کے ہم راہ آپ کے فرزند جاوید اقبال بھی تھے، جن کی عمر اُس وقت تقریباً دس سال تھی۔ سرہند جانے کے متعلق سید نذیر نیازی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: ”آج شام کی گاڑی میں سرہند جا رہا ہوں۔ چند روز ہوئے، صبح کی نماز کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ خواب میں کسی نے مندرجہ ذیل پیغام دیا: ”ہم نے جو خواب تمہارے اور شکلیب ارسلان (جو اتحادِ اسلامی کے زیر دست داعی تھے) متعلق دیکھا ہے، وہ سرہند بھیج دیا



ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ خدا تعالیٰ تم پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔ پیغام دینے والا معلوم نہیں ہو سکا کہ کون ہے۔ اسی خواب کی بناء پر وہاں کی حاضری ضروری ہے۔ اس کے علاوہ جب جاوید پیدا ہوا تھا تو میں نے عہد کیا تھا کہ جب وہ ذرا بڑا ہو گا اسے حضرت مجددؑ کے مزار پر لے جاؤں گا۔ وہ بھی ساتھ جائے گا، تا کہ یہ عہد بھی پورا ہو جائے۔“

### آخری ایام

عمر کے آخری حصے میں علامہ اقبال کو مختلف بیماریوں نے آلیا۔ اُدھر اُن کی بیگم (والدہ جاوید) کی علالت کی وجہ سے اُن کی پریشانیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ چناں چہ آپ وکالت کا کام جاری نہ رکھ سکے۔ یوں آپ کی آمدنی گھٹ گئی اور گزراوقات مشکل سے ہونے لگی۔ علامہ اقبال کے دوست سر اس مسعود آپ کی مالی پریشانیوں سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ انہی کی کوششوں سے نواب بھوپال کی طرف سے پانچ سو روپے وظیفہ مقرر کیا گیا۔ شکریے کے طور پر، سر اس مسعود کو خط لکھا: ”خدا تعالیٰ اُن کو جزائے خیر دے۔ انہوں نے میرے ساتھ عین وقت پر سلوک کیا۔ اب اگر صحت اچھی رہی تو بقیہ ایام اُن کی خواہش کے مطابق قرآن شریف پر نوٹ لکھنے میں صرف کروں گا۔“

دولت آصفیہ (حیدر آباد دکن) کے مدار المہام سرا کبر حیدری نے ایک ہزار روپے کا چیک بھیجا۔ اس چیک کے ساتھ ایک خط بھی تھا جس میں سر اکبر حیدری کی طرف سے لکھا تھا: ”یہ رقم شاہی توشے خانے سے ہے جس کا انتظام میرے ذمے ہے۔ بطور تواضع بھیجی جا رہی ہے۔“

”جس کا انتظام میرے ذمے ہے“ خط کے یہ الفاظ علامہ اقبال کی خود دار طبیعت پر گراں گزرے چنانچہ آپ نے کہہ کر کہ شاید آپ لوگوں نے مجھے نہیں



سمجھا چیک واپس کر دیا، اور اس واقعے سے متاثر ہو کر آپ نے ایک مختصر سی نظم بھی لکھی، جس کے چند اشعار یہ ہیں:

تھا یہ اللہ کا فرمان کہ شکوہ پر دیز  
دو قلندر کو، کہ ہیں اس میں ملو کا نہ صفات  
مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر  
حسن تدبیر سے دے آئی و فانی کو ثبات  
میں تو اس بار امانت کو اٹھاتا سر دوش  
کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات  
غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول  
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

صحت کی طرف سے جب مایوسی ہو گئی تو انہوں نے بچوں (جاوید اور منیرہ) کی تولیت بعض عزیزوں اور دوستوں کو سونپ دی۔ رشید احمد صدیقی کی مساعی سے ایک جرمن خاتون نے اُن کا گائیڈ بننا قبول کر لیا۔ ۱۹۳۷ء کے موسم گرما میں مس ڈور الینڈ نے، جسے عام طور پر بیگم حسین کے نام سے پکارا جاتا تھا، ”جاوید منزل“ کا چارج خود سنبھال لیا اور یوں علامہ اقبال کو ایک بڑی فکر سے نجات حاصل ہوئی۔

## حج کی خواہش نامتمام

آخری عمر میں علامہ اقبال کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح حج کر لیں اور مدینہ منورہ میں روضہ نبویؐ پر حاضری دے سکیں۔ ایک دفعہ عبدالرحمن طارق صاحب آپ سے ملنے کے لیے میکلوڈ روڈ والی کوٹھی پر گئے۔ سردیوں کے دن تھے اور آپ برآمدے میں بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ طبیعت پر ایک کیف اور وجد کا عالم طاری تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی



- آسمان کی طرف بار بار انگشتِ شہادت اٹھاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

ادب گاہیت، زیرِ آسمان از عرش، نازک تر  
نفسِ گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا  
(ترجمہ: ”آسمان کے نیچے ایک ایسی ادب گاہ ہے جو عرش سے بھی نازک تر  
ہے۔ یہاں تو جنید و بایزید جیسی بزرگ ہستیاں بھی ادب و احترام سے دم بہ خود حاضر  
ہوتی ہیں۔)

تقریباً دس پندرہ منٹ تک یہی عالم رہا۔ جب طبیعتِ قدرے بحال ہوئی تو  
طارق صاحب نے عرض کیا۔

”آپ ادب گاہِ مدینہ کی زیارت کے لیے مدتِ بے چین ہیں۔ اس آرزو  
کو کب عملی جامہ پہنائیں گے؟“

ایک آہ سرد بھر کر فرمایا: ”اللہ اور اُس کے رسولؐ نے حج کے لیے بھی کچھ  
شرائطِ عائد کر رکھی ہیں اور اُن میں سے اہم ترین شرائط یہ ہیں کہ انسان کسی کا  
مقروض نہ ہو۔ والدین اور بیوی بچوں کے لیے خرچ چھوڑ جائے اور حج کے لیے اس  
قدر زورِ راہ لے کر جائے کہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ میرے پاس نہ اتنی گنجائش ہے اور  
نہ میں یہ آرزو پوری کر سکتا ہوں۔ نتیجہ یہ ہے کہ فراقِ رسولؐ میں مرغِ ہمسلی کی  
مانند تڑپ رہا ہوں اور اسی سوز و درد کا شب و روز لطف لیتا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے علامہ کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو ٹپکنے لگے اور اپنی یہ رباعی دو  
تین مرتبہ پڑھی۔

غَمِ رَایِ نِشاطِ آمیز تر کن  
فِغائِشِ رَا جَنوں آمیز تر کن



گبیر اے سارباں راہ درازے  
مرا سوزِ جدائی تیز تر کن

ترجمہ: ”اے ساربان راہِ مجاز، اس راہی کے غم میں نشاط و خوشی کا مزید اضافہ کر، اور اس کے آہ و فغاں میں کچھ اور جنونِ عشق شامل کر۔ اے ساربان! منزلِ محبوب کی جانب کوئی راہِ دراز اختیار کر اور یوں میرے سوزِ جدائی کو اور بھی تیز کر دے۔“

وفات سے کچھ عرصہ پہلے بہاول پور کے ایک پیر صاحب کو حج کی تیاری کرتے ہوئے دیکھ کر آپ کا شوق اور بھی تیز ہو گیا۔ آپ نے سفرِ حج کے لیے باقاعدہ تیاریاں شروع کر دیں۔ کسی نے کہا، صحت کی خرابی کے علاوہ آپ کی آنکھوں سے بھی پانی اُتر رہا ہے۔ اس حالت میں آپ حج کا سفر کس طرح کر سکتے ہیں۔ اس پر آپ نے ہر جوشِ لہجے میں فرمایا: ”آنکھوں کا کیا ہے؟ آخر اندھے بھی توجہ کراتے ہیں۔“

## آخری بیماری

آخری عُمر میں جبکہ عامہ کی باتیں آنکھ بھی جواب دے چکی تھیں، اُن کا حافظہ بہت تیز ہو گیا تھا اور انہیں اس بات پر کوئی افسوس نہ تھا کہ وہ کسی کتاب کا مطالعہ نہیں کر سکتے۔ بیماری میں بھی خطوں کا جواب باقاعدگی سے لکھواتے تھے۔ کبھی جاوید سے، کبھی نذیر نیازی صاحب سے اور کبھی کسی اور دوست سے خط لکھواتے۔ اب اُن کی دل چسپی کے دو محور تھے۔ اول یہ کہ مسلمانوں کی بہتری کے لیے کہاں، کیا کچھ ہو رہا ہے یا کچھ کرنا چاہیے۔ دوم یورپ کے سیاسی حالات کیا کروٹ بدل رہے ہیں۔ چوں کہ انہیں جنگِ عظیم دوم کے برپا ہونے کا یقین تھا، اس لیے یورپ کے حالات خاص طور پر پڑھوا کر سنتے تھے۔ جب کوئی شخص اُن کی مزاج



پُرسی اور عیادت کے لیے آتا تو اقبال اُس سے یہ ضرور پوچھتے: ”آج کیا خبر ہے؟“  
 بیماری کی حالت میں ایک رات کافی دیر تک گریہ زاری کرتے رہے۔  
 کسی نے رونے کا سبب پوچھا تو فرمایا: ”خدا جانے مسلمان قوم کا کیا حشر ہو گا۔ مجھے  
 اس کا خیال رہ رہ کر سستا ہے۔“

جب سے بیماری میں شدت آئی تھی، صبح کی تلاوت چھوٹ گئی تھی۔ آپ  
 کسی سے قرآن پڑھوا کر سن لیتے۔ اس دوران میں آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرتے  
 رہے۔ تلاوت کے چھوٹ جانے کا ذکر اس شعر میں کس حسرت سے کیا ہے۔

در نفس سوزِ جگر باقی نماند  
 لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

ایک دفعہ علی بخش سے کہا کہ نماز پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ نماز کے لیے وہ  
 خود تو وضو نہیں کر سکتے تھے۔ علی بخش نے لیے لیے انھیں وضو کرا دیا۔ چنانچہ آپ  
 نے چار پائی پر بیٹھ کر نماز پڑھی۔

۳ مارچ ۱۹۳۸ء کو ضعفِ قلب اس قدر بڑھ گیا کہ غشی طاری ہو گئی۔  
 چنانچہ حکیم قرشی کا علاج شروع کیا گیا، جس سے حالت ذرا سنبھل گئی، لیکن یہ  
 کیفیت دیر تک قائم نہ رہی اور تکلیف دوبارہ عود کر آئی۔ اُن کے بڑے بھائی شیخ عطا  
 محمد نے تسکین کے چند کلمات کہے تو علامہ نے فوراً جواب دیا: ”میں مسلمان ہوں اور  
 موت سے نہیں ڈرتا۔“ اس کے بعد اپنا یہ شعر پڑھا۔

نشانِ مروِ مومن با تو گویم  
 چو مرگ آید تبسم بر لبِ او ست

ایک دفعہ ممتاز حسن انھیں ملنے کے لیے آئے۔ اپنی بیماری کے بارے میں  
 عجیب و غریب توجیہ کرتے ہوئے آپ نے قدرے مسکرا کر کہا: ”یہ جو میں زندگی



اور کائنات کے بڑے بڑے راز آپ لوگوں کو بتاتا ہوں، یہ بیماری اُس کی سزا ہے۔“

۱۹ مارچ کو پاؤں پر درم آ گیا اور جگر نے اپنا فعل سرانجام دینا کم کر دیا۔  
۲۵ مارچ کو بیماری نے نہایت نازک صورت اختیار کر لی۔

۲۰ اپریل کو آقا مر قاضی احمد خاں عیادت کے لیے آئے۔ عین اُسی وقت جاوید اقبال کو جو اُس وقت تیرہ سال کے تھے، کمرے میں وارد ہوئے۔ علامہ نے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”بیٹے! تم میرے پاس آ کر بیٹھا کرو۔ میں شاید چند روز کا مہمان ہوں۔“

حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ ابھی کم عمر ہے، (اُس وقت جاوید چودہ سال کے تھے۔) اس لیے آپ کی بیماری سے گھبرایا گھبرایا رہتا ہے۔ علامہ نے فرمایا: ”اسے ہر افتاد کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کرنی چاہیے۔“

۲۰ اپریل کی رات علامہ اقبال کے پاس م ش (میاں محمد شفیع) ڈاکٹر عبد القیوم اور راجہ حسن اختر موجود تھے۔ آخری رات کے متعلق جاوید اقبال اپنی تصنیف ”مئے لالہ فام“ میں لکھتے ہیں: آخری رات عقیدت مندوں کا جم گھٹا تھا۔ میں کوئی دو بجے اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ مجھے پہچان نہ سکے۔ پوچھا: ”کون ہے؟“ میں نے جواب دیا: ”جاوید ہوں۔“ ہنس پڑے اور بولے: ”جاوید بن کر دکھاؤ تو جانیں۔“ پھر اپنے قریب بیٹھے ہوئے چودھری محمد حسین سے مخاطب ہو کر فرمایا: اسے جاوید نامہ کے آخر میں وہ دعا ”خطاب بہ جاوید“ ضرور پڑھوا دیجیے۔“

شانون میں درد ہونے لگا تو علامہ نے علی بخش کو شانے دبانے کے لیے کہا۔ پھر اچانک لیٹے لیٹے اپنے پاؤں پھیلا دیے۔ اوپر کی طرف آنکھیں اٹھائیں اور بایاں ہاتھ دل پر رکھا اور دائیں ہاتھ سے سر کو تھامتے ہوئے کہا: ”یا اللہ۔“ اس کے



### ہیامبر اقبال

ساتھ ہی سر پیچھے کی طرف ڈھلک گیا، اور قبلہ رو ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور  
پانچ بج کر چودہ منٹ پر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔  
وفات سے دس منٹ پہلے اقبال نے اپنے بارے میں یہ رباعی کہی تھی جو  
وصال کے وقت آپ کے ہونٹوں پر جاری تھی۔

سرودِ رفته باز آید کہ ناید  
نیسے از حجاز آید کہ ناید  
سر آمد روزگارے ایں فقیرے  
دگر دانائے راز، آید کہ ناید





باب نمبر ۲

# پیامِ منظوم





علامہ اقبال کی فلسفیانہ شاعری کے بارہ مجموعے فارسی اور اردو میں شائع ہوئے، چار اردو میں اور آٹھ فارسی میں۔ یہاں ان بارہ مجموعہ ہائے کلام کا تعارف اُن کی ترتیب طباعت و اشاعت کے لحاظ سے کرایا جا رہا ہے۔ ان مجموعوں میں شامل ہر شعر اور ہر مصرع نو جوانوں ہی کو مخاطب کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

### (۱) اُسرارِ خودی

فارسی زبان میں یہ مثنوی سب سے پہلے ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ اس مثنوی کا پس منظر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ علامہ صاحب کے والد محترم نے ایک دفعہ اُن سے فرمائش کی تھی کہ وہ بوعلی قلندر کی مثنوی کے نمونے پر فارسی زبان میں ایک مثنوی لکھیں۔ چنانچہ اقبال نے پہلے ۱۱۵۰ اشعار لکھے، لیکن پھر یہ خیال کر کے ان اشعار میں ان کا مافی الضمیر صحیح طریقے سے ادا نہیں ہو پایا، اسے تلف کر دیا۔ چند سال بعد اسے دوبارہ لکھنا شروع کیا اور یہ کام ۱۹۱۴ء میں ختم ہوا۔

اس مثنوی میں افلاطون اور خاص طور پر حافظ شیرازی کی شاعری پر تنقید کی گئی تھی۔ اس پر حافظ کے معتقدین نے سخت طوفان برپا کر دیا۔ جب یہ سلسلہ طول پکڑ گیا اور علامہ کے والد نے اُن سے حقیقتِ حال سے متعلق استفسار کیا تو اُنھوں نے جواب دیا: ”میں نے حافظ کی ذات اور شخصیت پر اعتراض نہیں کیا۔ میں نے صرف ایک اصول کی تشریح کی ہے۔ اس کا افسوس ہے کہ مسلمانانِ وطن پر عجبی اثرات اس قدر غالب آچکے ہیں کہ وہ زہر کو آبِ حیات سمجھتے ہیں۔“

علامہ کے والد صاحب نے فرمایا کہ حافظ کے عقیدت مندوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائے بغیر اس اصول کی وضاحت کر دی جاتی تو اچھا ہوتا۔ اقبال نے جواب دیا کہ یہ حافظ پرستی بھی تو بُت پرستی سے کم نہیں۔ اس پر علامہ کے والد نے کہا کہ



### پیام منظوم

اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے تو غیر مسلموں کے خداؤں کو بھی برا بھلا کہنے سے منع فرمایا ہے، اس لیے حافظ سے متعلق جن اشعار پر لوگوں کو اعتراض ہے، انہیں حذف کر دینا مناسب رہے گا۔ علامہ نے مسکرا کر اپنے والد کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور دوسرے ایڈیشن میں متعلقہ اشعار حذف کر کے اُن کی جگہ نئے اشعار لکھ دیے۔

یہ حیثیت مجموعی ”اسرارِ خودی“ کو بہت سراہا گیا۔ ایک صحبت میں ایران کے پروفیسر محمد کاظم شیرازی بھی موجود تھے۔ جب یہ مثنوی پڑھی جا رہی تھی تو پروفیسر موصوف اشعار اُسُن کر جھوم رہے تھے اور ایک ایک شعر پر داد دے رہے تھے اور بار بار کہتے تھے: ”کاش یہ شاعر ایران میں پیدا ہوا ہوتا۔“

”مثنوی اسرارِ خودی“ کو انگلستان میں بھی خوش آمدید کہا گیا۔ پروفیسر نکلسن نے جب ”اسرارِ خودی“ پڑھی تو وہ بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ انھوں نے علامہ اقبال کو لکھا کہ وہ اس مثنوی کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہتے ہیں اور باقاعدہ اجازت کے خواہاں ہیں۔ جب یہ خط علامہ اقبال کو لاہور میں موصول ہوا تو وہ بے اختیار رو پڑے۔ فقیر وحید الدین نے استفسار کیا تو آپ نے فرمایا: ”میرے عوام جن کے لیے میں نے یہ کتاب لکھی، نہ تو اس کی قدر و قیمت پہچانتے ہیں اور نہ اسے کوئی بڑا کام سمجھتے ہیں، لیکن یورپ جس کے لیے میں نے یہ کتاب نہیں لکھی، میرا پیغام سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

۱۹۲۰ء میں ”اسرارِ خودی“ کے انگریزی ترجمے کے ساتھ ہی علامہ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ کئی نقادوں نے اس کتاب پر بیش قیمت تبصرے لکھے۔ امریکا کے دانش ور ڈاکٹر ہربرٹ ریڈ نے ۲۵ اگست ۱۹۲۱ء کو لکھا: ”میرے ذہن میں اگر کسی زندہ شاعر کا خیال آ سکتا ہے تو وہ ایک ہی ہے،



## پیام منظوم

اور وہ بھی لازمی طور پر ہمارا ہم قوم ہے نہ ہمارا ہم مذہب۔ میری مراد اقبال سے ہے، جس کی مثنوی ”اسرارِ خودی“ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا، ڈاکٹر ریٹالڈ نکلسن کے قلم سے اصل زبان فارسی سے انگریزی میں ترجمہ ہو کر میسرز میکملن پبلشرز کے اہتمام سے شائع ہوئی ہے۔ اس زمانے میں جبکہ ہمارے ہم وطن شاعر بلیوں اور بیروں پر ٹگ بندی سے اپنے یاروں کی ضیافتِ طبع کا سامان پیدا کر رہے تھے اور کیٹس کے انداز میں پیش پا افتادہ مضامین پر طبع آزمائی میں مشغول تھے، عین اس وقت لاہور میں یہ نظم تصنیف ہوئی، جس کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں کے خیالات میں ایک محشر بپا کر دیا ہے.....“

## (۲) رموزِ بے خودی

۱۹۱۸ء میں ”اسرارِ خودی“ کا دوسرا حصہ فارسی زبان میں ”رموزِ بے خودی“ کے نام سے شائع ہوا۔ ”اسرارِ خودی“ کے برعکس اس میں افراد کو خودی مٹانے کا درس نہیں دیا گیا، بلکہ کہا گیا ہے کہ افراد اپنی خودی کی تکمیل کے بعد وسیع تر ملت کے استحکام کے لیے اپنی خودی کو ملت کی خودی میں ضم کر دیں۔ بعد ازاں یہ جدت پیدا کی گئی کہ ”اسرارِ خودی“ اور ”رموزِ بے خودی“ کو ”اسرار اور رموز“ کے نام سے یک جا کر کے ۱۹۳۰ء میں شائع کیا گیا۔ ”رموزِ بے خودی“ کا انگریزی ترجمہ پروفیسر آربری نے اور عربی ترجمہ عبدالوہاب نے کیا جو ۱۹۵۵ء میں قاہرہ سے شائع ہوا۔ ترکی زبان میں دونوں مثنویوں کا ترجمہ ۱۹۵۰ء میں چھپا۔ جسٹس ایس اے رحمن مرحوم نے اردو میں صرف پہلے حصے یعنی ”اسرارِ خودی“ کا ترجمہ ”ترجمانِ اسرار“ کے نام سے کیا۔

## (۳) پیامِ مشرق

یہ بھی فارسی زبان میں ہے۔ ۱۹۴۲ء کے اواخر میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب





جرمن شاعر گوئٹے کی تصنیف ”پیامِ مغرب“ کے جواب میں لکھی گئی۔ گوئٹے نے مشرقی ادبیات کا مطالعہ کیا تھا، بالخصوص مولانا روم کی مثنوی سے کافی استفادہ کیا، لیکن اُن کے فلسفے کے بہت سے حصوں سے اتفاق نہیں کیا اور اپنی ساری کوشش یہ ثابت کرنے میں صرف کر دی کہ مغرب ہی دنیائے انسانیت کے مسائل حل کرنے کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس سے علامہ اقبال کے جذبہ ملی کو ٹھیس پہنچی اور انہوں نے گوئٹے کی تردید کرتے ہوئے ثابت کیا کہ جس علم سے آج مغرب فیض اٹھا رہا ہے، وہ مشرق کا اور خصوصاً مسلمانوں کا ورثہ ہے۔

”پیامِ مشرق“ کا انتساب افغانستان کے ایک سابق فرماں روا امیر امان اللہ خان نیازی سے کیا گیا ہے جس کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کتاب کے دیباچے میں لکھا: ”اس وقت دنیا میں اور بالخصوص مشرقی ممالک میں ہر ایسی کوشش، جس کا مقصد افراد و قوم کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابل احترام ہے۔ اسی بنا پر میں نے ان چند اوراق کو اعلیٰ حضرت فرماں روا نے افغانستان کے نامہ نامی سے منسوب کیا ہے کہ وہ اپنی فطری ذہانت و فطانت سے اس نکتے سے بخوبی آگاہ معلوم ہوتے ہیں، اور افغانوں کی تربیت خاص طور پر ان کے مد نظر ہے۔ اس عظیم الشان کام میں خدا تعالیٰ اُن کا حامی و ناصر ہو۔“

”پیامِ مشرق“ کے پہلے ایڈیشن پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ اس میں اہل عجم ہی کو کیوں مخاطب کیا گیا ہے اور عجم ہی کی بہتری کیوں چاہی گئی ہے۔ چنانچہ دوسرے ایڈیشن میں اس اعتراض کے پیش نظر علامہ اقبال نے صفحہ اول پر یہ آیت لکھوا دی: ”وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ“

اس کتاب میں وہ معارف بیان کیے گئے ہیں جو افراد اور اقوام کی باطنی



### پیامِ مظلوم

تربیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ قوموں کا زوال، اجتماعی افسردگی، سیاستِ حاضرہ کی فریب کاریوں اور یورپ میں انسانیت کی مٹی پلید کیے جانے کے ذکر کے ساتھ ساتھ تفسیرِ کائنات، میلادِ آدم، افکارِ ایلینس، ہبوطِ آدم اور قیامت کا قصہ فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں ”پیامِ مشرق“ کا فرانسیسی ترجمہ ”میر و وچ ایرا“ نے کیا۔

### (۴) بانگِ درا

یہ علامہ اقبال کا پہلا اردو شعری مجموعہ ہے جو پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ یورپ سے واپس آنے کے بعد علامہ کا ذوقِ سخن اس قدر بلند ہو گیا تھا کہ انہیں اپنے اولین اشعار و کچھ کرداشت سی محسوس ہوتی تھی اور وہ اپنے اس سارے دفتر کو تلف کرنا چاہتے تھے۔ اس دوران میں ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ اردو کلام شائع کیا جائے۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۳ء کو مولانا ظفر علی خان نے اپنے اخبار ”زمیندار“ کے ادارے میں علامہ پر زور دیا کہ وہ اپنا اردو کلام اشاعت کے لیے پریس میں دے دیں۔ چنانچہ انھیں اپنے عقیدت مندوں کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ ابھی وہ ابتدائی تیاریاں کر رہے تھے کہ حیدر آباد دکن کے مولوی عبدالرزاق نے علامہ سے اجازت لیے بغیر حیدر آباد سے ”کلیاتِ اقبال“ شائع کر دی۔ اقبال نے اس غیر قانونی بے قاعدگی کا فوری نوٹس لیا، لیکن سراکبر حیدری کے توسط سے ایک ہزار روپے رائلٹی طے ہو جانے کے بعد علامہ نے انہیں اس شرط پر ”کلیاتِ اقبال“ فروخت کرنے کی اجازت دے دی کہ وہ اس کی فروخت کو حیدر آباد تک ہی محدود رکھیں گے۔

”بانگِ درا“ علامہ صاحب کی تمام تخلیقات میں سب سے مقبول اور سب سے

زیادہ فروخت ہونے والا مجموعہ کلام ہے۔



## (۵) زبورِ عجم

اس کا پہلا ایڈیشن جون ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا۔ علامہ صاحب نے پہلے اس کتاب کے لیے ”زبورِ جدید“ کا نام تجویز کیا تھا، لیکن بعد میں ”زبورِ عجم“ رکھا گیا۔ اس مجموعے میں فارسی کی ۶۶ غزلیں ہیں، جن میں عشق، عاشق، معشوق، شراب، جام، صراحی اور رُخسار کی پرانی عجمی اصطلاحات کو بالکل نئے معنی اور پیرائے میں استعمال کیا گیا ہے۔ اب عشق کا تعلق عاشق اور معشوق سے نہیں رہا۔ بلکہ انسان، خدا اور اقبال کی مثلث کے اندر ہی گھومتا ہے۔ اب عشق سے مایوسی اور قنوطیت پیدا نہیں ہوتی، بلکہ رجائیت اور اُمنگ پیدا ہوتی ہے۔ ”زبورِ عجم“ کا دوسرا حصہ ”گلشنِ رازِ جدید“ کے نام سے شامل ہے، جو مثنوی کی صرپ، تصوف کے موضوع پر شیخ محمود شبستری کی مشہور تصنیف ”گلشنِ راز“۔ جواب میں لکھی تھی۔ تیسرا حصہ ”بندگی نامہ“ ہے، جس میں انھوں نے غلامی کے بُرے اثرات سے بچنے کی تلقین کی ہے اور آزادی کے لیے ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا کیا ہے، اور اسی حوالے سے آزاد اور غلام قوموں کے فنِ تعمیر اور دیگر فنون لطیفہ پر تبصرہ کیا ہے۔ چہ حیثیت مجموعی ”زبورِ عجم“ بد حال اور بے آسرا افراد کی اخلاقی پستیوں کا تذکرہ ہے، جن کو مایوسی سے نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

## (۶) جاوید نامہ

علامہ اقبال نے اٹلی کے شاعر دانٹے کی شاعرانہ تصنیف ”المیہِ خداوندی“ (ڈیوائن کامیڈی) کے جواب میں، تین سال کی شبانہ روز محنت شاقہ کے بعد ”جاوید نامہ“ لکھ کر ۱۹۳۲ء میں شائع کیا۔ یہ دراصل ”معراج نامہ“ ہے، جس میں علامہ تخیل کے پر لگا کر افلاک کی سیر کرتے ہیں۔ اس ذہنی و روحانی معراج کے دوران اُن کی ملاقاتیں کئی مسلم اور غیر مسلم مشاہیر سے ہوتی ہیں۔ مسلم مشاہیر کے ساتھ



پیام منظوم

ساتھ غیر مسلم مشاہیر کا ذکر کرنا علامہ اقبال کی وسیع الشربہ اور وسعت قلبی کی دلالت کرتا ہے۔ ”جاوید نامہ“ میں علم، عقل اور عشق کا موازنہ پیش کیا گیا ہے اور ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑنے والوں کا بھی ذکر ہے۔ کشمیر جنت نظیر کی ربوں حالی اور کشمیری کا بیان بھی ہے۔ کتاب کے آخر میں ”خطاب بہ جاوید“ (سخن بہ نژادِ نو) شامل ہے جو نوجوانوں کے نقطہ نظر سے خاص چیز ہے۔ ”جاوید نامہ“ علامہ اقبال کی نہایت اہم تصنیف ہے۔ اس کا ترکی زبان میں ترجمہ ڈاکٹر امین میری شمل نے ۱۹۵۸ء میں انقرہ سے شائع کیا۔ اٹلی میں بوسانی نے اسے جرمن زبان میں منتقل کیا۔

(۷) بال جبریل

یہ اردو کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جو ”بانگ درا“ کی اشاعت کے گیارہ سال بعد ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ پہلے اس مجموعے کا نام ”نشانِ منزل“ تجویز ہوا تھا۔ ”بال جبریل“ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کی فکر اُس آخری نقطے تک پہنچ چکی ہے جو وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا مقام اتصال ہے۔ یہ نوری نقطہ انسان کی خودی ہے۔ اقبال نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کو طرح طرح سے اپنی جولان گاہ فکر بنایا ہے اور شاعرانہ لطافت بیان سے اس خشک اور سنجیدہ ترین عقدے کی گرہ کشائی میں طبع رسا اور توجہ کامل کی تمام توانائیاں اور رعنائیاں صرف کر دی ہیں۔

(۸) مثنوی مسافر

یہ مثنوی ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ فارسی میں ہے۔ والی افغانستان نادر شاہ نے افغانستان میں تعلیمی اصلاحات کی غرض سے ہندوستان کی تین مقتدر شخصیتوں کو افغانستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ علامہ اقبال کے علاوہ سر راس مسعود اور علامہ سید سلیمان ندوی بھی شریک سفر تھے۔ علامہ صاحب نے



افغانستان کا سفر کرنے کے بعد اپنے تاثرات اس ”مثنوی“ کی صورت میں ظاہر کیے تھے۔

## (۹) ضربِ کلیم

”بانگِ درا“ کے بعد علامہ کی شاعری کا ارتقائی زینہ ”بالِ جبریل“ اور ”ضربِ کلیم“ ہیں جو ”بانگِ درا“ ہی کے بطن سے ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ ان دونوں مجموعوں کا دائرہ فکر زیادہ وسیع اور آفاق گیر ہے۔ ”بالِ جبریل“ کی اشاعت سے اگلے برس ۱۹۳۶ء میں ”ضربِ کلیم“ شائع ہوا۔ ”ضربِ کلیم“ میں اقبال کے دل و دماغ پر فلسفہ اپنی بھرپور طاقت سے غالب نظر آتا ہے، اور امر واقعہ یہ ہے کہ اس مقام پر وہ ایک بے نظیر متکلم کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ فلسفہ تشکیک کی گرد سے آلودہ ہے، لیکن اعلیٰ علمِ کلامِ دلیل و برہان کی رو سے مسائلِ سلوک و عرفان کا حل پیش کرتا ہے۔

پہلے اس مجموعے کے لیے ”صورِ اسرافیل“ کا نام تجویز ہوا تھا، لیکن بعد میں یہ نام ”ضربِ کلیم“ سے بدل دیا گیا۔ یہ کتاب نواب سر حمید اللہ خان، نواب بھوپال کے نام سے منسوب ہے۔ اس کا فارسی ترجمہ خواجہ عبدالحمید عرفان نے ۱۹۵۷ء میں کیا۔ انگریزی ترجمے کی سعادت ۱۹۳۷ء میں وی ایس کرنان کو حاصل ہوئی، جنہوں نے اسے نہایت اہتمام سے بمبئی سے شائع کیا۔

## (۱۰) پس چہ باید کرد، اے اقوامِ مشرق

یہ فارسی مثنوی ۱۹۳۶ء میں ”ضربِ کلیم“ کی اشاعت کے فوراً بعد شائع ہوئی۔ اس مثنوی کی تخلیق کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ۱۳/۱۳ اپریل ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبال بھوپال کے شیش محل میں سوئے ہوئے تھے کہ رات کے تین بجے سرسید نے اُن سے خواب میں پوچھا: ”اقبال، تم کب سے بیمار ہو؟“ علامہ نے جواب دیا:



پیام منظوم

”دو سال سے“۔ سر سید نے فرمایا: ”حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور کیوں التجا نہیں کرتے۔“ اس پر اُن کی آنکھ کھل گئی اور انہوں نے عرض داشت کے طور پر چند اشعار کہے جو بعد میں مثنوی کی شکل اختیار کر گئے۔







باب نمبر ۳

# پیامِ اقبال کا ارتقا





[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

نوجوان یا نئی نسل یا اقبال کی اصطلاح میں نژادِ نو سے کیا مراد ہے؟ نئی اور پرانی نسل میں کیا فرق ہے؟ عموماً ایک نسل کا زمانہ تیس سال کے قریب بتایا گیا ہے۔ جب بچے جوان ہو جاتے ہیں اور اپنی ذمہ داریاں خود سنبھال لیتے ہیں تو وہ پرانی نسل کا حصہ بننے لگتے ہیں، یعنی تیس پینتیس سال کی عمر تک تو انسان نئی نسل کا نمائندہ ہوتا ہے، اور اس کے بعد پرانی نسل کا فرد بن جاتا ہے، مگر نئی اور پرانی نسل میں امتیاز کرنا اور ان کے درمیان کوئی واضح لکیر کھینچنا ممکن نہیں، کیونکہ ہر لمحہ نئی نسل پرانی نسل میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارا مستقبل حال میں اور حال ماضی میں تبدیل ہو رہا ہے، اس لیے اگر کسی ایک وقت میں ایک نسل نئی ہوتی ہے تو ذرا آگے چل کر وہی نسل پرانی ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نئی اور پرانی نسل (بچے، جوان، بوڑھے) بیک وقت موجود ہوتی ہیں، مگر جو بات یہاں خاص طور پر ذہن نشین ہونی چاہیے، وہ یہ ہے کہ نئی نسل، پرانی نسل سے اپنے جذباتی اور فکری رویوں میں مختلف ہوتی ہے۔ نئی نسل کے افراد میں فکر کی کمی اور جذبے کی فراوانی ہوتی ہے، جب کہ پرانی نسل میں جذبے کی کمی اور فکر کی زیادتی ہوتی ہے۔ وہ سوچتے زیادہ، مگر عمل کم کرتے ہیں۔ اس اصول میں استثناء کی گنجائش موجود رہتی ہے، مگر عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ نئی نسل کے افراد نوجوان ہوتے ہیں اور ان کے جسم میں زیادہ توانائی ہوتی ہے، اس لیے وہ اپنے مستقبل سے خوف زدہ نہیں ہوتے۔ ایک نوجوان کو مادی دولت کی اتنی پروا نہیں ہوتی، جتنی ایک بوڑھے شخص کو ہوتی ہے۔ نئی نسل عموماً مالی و اقتصادی ذمہ داریوں سے آزاد ہوتی ہے اور اسے اپنے آپ پر اعتماد ہوتا ہے کہ وہ دولت کے بغیر بھی زندگی بسر کر سکتی ہے، جبکہ پرانی نسل دولت کو بیساکھی کے طور پر استعمال کرتی ہے۔



در اصل عملی زندگی نے (اور خصوصاً پرانی نسل نے) نوجوانوں کو یہی سبق پڑھایا ہوتا ہے کہ دولت زندگی کی سب سے بڑی قدر ہے اور اس سے سارے کام بنائے یا بگاڑے جاسکتے ہیں، مگر نوجوان مادی دولت کے اس طلسماتی اثر سے آزاد ہوتے ہیں، کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوت بازو سے دولت پیدا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جہاں پرانی نسل جبینہ وغیرہ کا مطالبہ کرتی ہے، وہاں نئی نسل پیسے کی بجائے محبت کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ ان کے نزدیک انسان دولت سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ بوڑھے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں، جبکہ نوجوان بے خطر آتش نمرود میں کود پڑتے ہیں۔ پرانی نسل عقل کے سہارے چلتی ہے تو نئی نسل جذبہ (بہ قول اقبال عشق) کی قوت سے انقلاب برپا کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی تمام امیدیں نئی نسل سے وابستہ کر دی ہیں۔ چنانچہ وہ نوجوانوں کے لیے دعا مانگتے ہیں: اے خدا

ع نوجوانوں کو پیروں کا استاد کر

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ نئی نسل کے کچھ افراد ذہنی طور پر پرانی نسل سے، اور اسی طرح پرانی نسل کے کچھ افراد ذہنی طور پر نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہذا نئی اور پرانی نسل کا ذکر کرتے ہوئے عمر سے زیادہ ”رُوئے“ کو اہمیت حاصل ہے۔ عمر کا وہ حصہ جہاں نئی اور پرانی نسل کا سنگم ہوتا ہے، بڑا اہم اور پر اثر ہوتا ہے۔ زمانہ ہر لحظہ بدلتا رہتا ہے، مگر بعض افراد زمانے کا ساتھ دینے کی اہلیت رکھتے ہیں اور بعض افراد میں یہ اہلیت نہیں ہوتی۔ جب نوجوان نئی ذمہ داریوں سے آشنا ہوتے ہیں تو ان پر بڑا نازک وقت ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم ”بزمِ انجم“ میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔



آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا  
منزل بھی کنھن ہے، قوموں کی زندگی میں

اگر پرانی نسل کے افراد نئے زمانے (نئی نسل) کے تقاضوں کو نہ سمجھیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کا ذہنی ارتقا رک گیا ہے۔ ایسی صورت میں نئی اور پرانی نسل میں بُعد (Generation gap) پیدا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نئی نسل کے تمام افکار و اعمال درست ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نئی نسل زمانے کے تقاضوں کو نظر انداز کر دے اور اپنے آپ کو غیر ضروری مسائل میں الجھالے۔

علامہ اقبال کے وقت کی نئی نسل آج پرانی ہو چکی ہے، بلکہ اب تو دوسری، تیسری نئی نسل وجود میں آ چکی ہے۔ اقبال کے مخاطب نوجوان دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں یا پیرائہ سالی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے کہ علامہ اقبال کے مخاطب صرف اُن کے عہد کے خاص نوجوان تھے۔ انھوں نے شاہینِ نئی نسل، نژادِ نو یا اپنے فرزندِ جاوید اقبال کے تلازمات کے ذریعے دراصل ہر دور اور ہر عہد کے مسلم نوجوانوں کو خطاب کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مستقبل میں آنے والے تمام ادوار کے نوجوان بھی اقبال کے پیغام سے مستفید ہوں گے۔ پیامِ اقبال سے صرف وہی نوجوان مخرف ہو سکتے ہیں جو اپنے ماضی سے تعلق توڑ لے، حال سے تغافل برتے اور مستقبل سے بے اعتنائی اختیار کرے۔

اقبال کی شاعری تین واضح ادوار میں منقسم ہے۔ اُن کی جوانی کی شاعری، اُن کی پختہ سالی کی شاعری اور آخر میں اُن کے بڑھاپے کی شاعری۔ لیکن یہ ایک عجیب و غریب اور حیرت انگیز بات ہے کہ ان تینوں ادوار میں اُن کا مخاطب صرف نوجوان ہے، اور موضوعِ سخن بیش تر وہ جذباتی کیفیات رہی ہیں جو جوانی سے خاص ہیں۔ یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اقبال اگرچہ اپنی جوانی ہی میں بلوغ



فکر کے اعتبار سے پختہ سال اور پختہ سالی میں پیر دانا ہو چکے تھے، لیکن ان عناصر کے اعتبار سے اُن کی شاعری، اُن کے فلسفے، اُن کے جذبات، اُن کے محسوسات، اُن کے پیغام کے جو بنیادی عناصر ہیں، وہ ہمیشہ جوان رہے اور اُن کے سخن کی حرارت اور اُن کے پیغام کا خروش و جوانوں کے خون کی روانی تیز کرتا اور انھیں تسخیر ذات اور تسخیر کائنات دونوں پر آمادہ کرتا رہا۔

اقبال کی شاعری کا پہلا دور فطری طور پر مطالعے اور تیاری کا دور ہے۔ اُن کی جوانی کی شاعری کے بارے میں شیخ عبدالقادر ”بانگ درا“ کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

”طبیعت زوروں پر تھی۔ شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی۔ ایک ایک نشست میں بے شمار شعر ہو جاتے تھے۔ اُن کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے، پینسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور وہ اپنی ذہن میں کہتے جاتے۔ میں نے اُس ابتدائی زمانے میں انھیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکرِ سخن کرتے نہیں دیکھا۔ موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ اُبلتا معلوم ہوتا تھا۔ ایک خاص کیفیتِ رقت کی عموماً اُن پر طاری ہو جاتی تھی۔ اپنے اشعار سُرِ ملی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ خود وجد کرتے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے۔ یہ عجیب خصوصیت ہے کہ حافظہ ایسا پایا ہے کہ جتنے اشعار اس طرح زبان سے نکلیں، اگر وہ ایک مسلسل نظم کے ہوں تو سب کے سب دوسرے وقت اور دوسرے دن اسی ترتیب سے حافظے میں محفوظ ہوتے ہیں، جس ترتیب سے وہ کہے گئے تھے اور درمیان میں وہ خود انہیں قلم بند بھی نہیں کرتے۔ مجھے بہت سے شعراء کی ہم نشینی کا موقع ملا ہے اور بعض کو میں نے شعر کہتے بھی دیکھا اور سنا ہے، مگر یہ رنگ کسی اور میں نہیں دیکھا۔ اقبال کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایں ہمہ موزونی طبع، وہ سب فرمائش شعر کہنے سے قاصر ہے۔ جب طبیعت خود مائل نظم ہو تو جتنے شعر



چاہے، کہہ دے، مگر یہ کہ ہر وقت اور ہر موقع پر حسبِ فرمائش وہ کچھ لکھ سکے، یہ قریب قریب ناممکن ہے۔“

اقبال کی شاعری کے پہلے دور میں وہ سوز اور وہ سیمائی کیفیت موجود ضرور ہے، جسے اُن کے نظامِ سخن کی اولین خصوصیت کہنا چاہیے اور جو آگے چل کر اُن کی فکری اور الہامی شاعری پر سربہ سر چھا گئی، لیکن ابھی اُس نے وہ تلاطم انگیز اور آفاق گیر رنگ اختیار نہیں کیا تھا جو شعرِ اقبال کے دوسرے اور تیسرے دور سے نسبت رکھتا ہے۔ اقبال کے عہدِ شباب کا شعر خود نگری اور خود شناسی کی ایک لطیف و جمیل کیفیت سے سرشار ہے اور جب شاعر اس کیفیت سے ذرا چو نکتا ہے تو وہ اپنے گرد و پیش پر بھی ایک نظر ڈال لیتا ہے، لیکن اُس کے پاس اپنے مطالعہٴ نفسی کے اظہار اور ایک دلِ درد مند کی پکار کے سوا اور کوئی پیغام نہیں ہے۔ نوجوان شاعر اپنے نوجوان ہم عصروں کو کوئی پیغام دینے سے فطری طور پر ہچکچاتا ہے اور یہ اُس کی حقیقت پسندی اور عظمت کا ایک قطعی ثبوت ہے۔

ابھی تو نوجوان شاعر اپنی ذات کے تشخص میں مصروف ہے۔ ابھی وہ تو اپنی ذات سے مخاطب ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب نوجوان اقبال خود اپنی ذات کی شناخت میں منہمک تھا تو اُس کی اپنی زندگی کی کیا کیفیت تھی؟ اُس کی شخصیت اور فکر کی تعمیر کس طور ہو رہی تھی؟ وہ اپنے بارے میں کیا سوچتا تھا؟ ان سوالوں کا جواب ہم خود اقبال کے اشعار میں ڈھونڈتے ہیں۔

خُسن ہو کیا خود نما، جب کوئی ماکل ہی نہ ہو  
شمع کو جلنے سے کیا مطلب، جو محفل ہی نہ ہو  
ذوقِ گویائیِ خموشی سے بدلتا کیوں نہیں  
میرے آئینے سے یہ جو ہر نکلتا کیوں نہیں

(صدائے درد، ص ۲۹)



پیام اقبال کا ارتقا

منزل کا اشتیاق ہے، غم کردہ راہ ہوں  
اے شمع! میں اسیر فریب نگاہ ہوں  
میں حسن ہوں کہ سراپا گداز ہوں  
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں  
(شمع۔ ص ۳۱)

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب  
کیا لطف انجمن کا، جب دل ہی بچھ گیا ہو  
شورش سے بھاگتا ہوں، دل ڈھونڈتا ہے میرا  
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو  
مرتا ہوں خامشی پر، یہ آرزو ہے میری  
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھوپڑا ہو  
آزاد فکر سے ہوں، عزلت میں دن گزاروں  
دنیا کے غم کا دل سے، کانٹا نکل گیا ہو  
پھولوں کو آئے جس دم، شبنم وضو کرانے  
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دُعا ہو  
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے  
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو  
ہر درد مند دل کو رونا مرا رُلا دے  
بے ہوش جو پڑے ہیں، شاید انہیں جگا دے

(ایک آرزو۔ ص ۲۹)

جوانی کی شاعری میں اقبال حالاتِ حاضرہ، اہل ہند کی غلامی اور فرنگیوں کے  
سامراجی حربوں پر بھی کڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔



ہیام اقبال کا ارتقا

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستان مجھ کو  
 کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں  
 سُن اے غافل صدا میری! یہ ایسی چیز ہے جس کو  
 وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں  
 وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے  
 تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں  
 ذرا دیکھ اُس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے  
 دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں  
 نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے، اے ہندوستان والو!  
 تمہاری داستان تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں  
 ہویدا آج اپنے زخم، پنہاں کر کے چھوڑوں گا  
 لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا  
 جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے  
 تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا  
 مگر غنچوں کی صورت میں دلی درد آشنا پیدا  
 چمن میں مُشبِ خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا  
 مجھے اے ہم نشیں! رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں  
 کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا  
 دکھا دوں گا جہاں کو جو مری آنکھوں نے دیکھا ہے  
 تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

(تصویر درد۔ ص ۵۲)

”ترانہ ہندی“ بھی عہدِ شباب کی شاعری کی تخلیق ہے۔ یہ ترانہ حصولِ

آزادی کے بعد بھارت کی حکومت نے سرکاری ترانے کے طور پر منظور کر لیا ہے۔



..... پیام اقبال کا ارتقا .....

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا  
ہم بلبلیں ہیں اس کی، یہ گلستاں ہمارا  
مذہب نہیں سکھاتا، آپس میں پیر رکھنا  
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستان ہمارا  
اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں  
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

ترانہ ہندی (ص ۶۱)

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اقبال کی عہد شباب کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت خود نگری اور خود شناسی ہے۔ البتہ اُس طوفان کے ابتدائی خروش اور اولین بے تابیوں کا ایک ہلکا سا اظہار ہے جو شروع دن سے اُس کے قلب و جگر میں پرورش پا رہا تھا۔ نوجوان اقبال اپنی قوم کے نوجوانوں کی رہنمائی کی کوشش نہیں کرتا، لیکن لاشعوری طور پر اُس کا مخاطب نوجوان ہی ہے۔ تاہم اقبال کھلم کھلا نوجوان سے گفتگو کرتا، بلکہ اپنے پردہ دل کا ایک کونا اٹھا کر دعوتِ نظارہ دے دیتا ہے۔ یہاں یہ سوال بھی بے حد دلچسپ ہے کہ زندگی کی اس منزل پر خود اُس کے اپنے نفس کی کیا کیفیت تھی؟ اور اُس کی شخصیت اور فکر کی تعمیر کس انداز سے جاری تھی؟ اس کا جواب اقبال نے اپنی بہت ہی سادہ نظم ”زہد اور رندی“ میں نہایت لطیف پیرایے میں بیان کیا ہے اس نظم میں درحقیقت اقبال نے اپنا تجزیہ نفس کیا ہے، جیسے وہ خود آئینے کے رُوبہ رُو ہوں۔ پوری نظم ملاحظہ ہو۔

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی  
تیزی نہیں منظور، طبیعت کی دکھانی



پیام اقبال کا ارتقا

شہرہ تھا بہت آپ کی صوفی منشی کا  
 کرتے تھے ادب ان کا اعلیٰ و ادانی  
 کہتے تھے کہ پنہاں ہے تصوف میں شریعت  
 جس طرح کہ الفاظ میں مضمحل ہوں معانی  
 لبریز مئے زہد سے تھی دل کی صراحی  
 تھی تہ میں کہیں دُردِ خیال ہمہ دانی  
 کرتے تھے بیان آپ کرامات کا اپنی  
 منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی  
 مدت سے رہا کرتے تھے ہمسایے میں میرے  
 تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی  
 حضرت نے میرے ایک شناسا سے یہ پوچھا  
 اقبال کہ ہے قمری شمشادِ معانی  
 پابندی احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟  
 گو شعر میں ہے رشکِ کلیمِ ہمدانی  
 سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا  
 ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی  
 ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا  
 تفصیل علیٰ ہم نے سنی اس کی زبانی  
 سمجھا ہے کہ ہے راگِ عبادات میں داخل  
 مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی  
 کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے  
 عادت یہ ہمارے شعراء کی ہے پرانی



گانا جو ہے شب کو، تو سحر کو ہے تلاوت  
اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی  
لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے  
بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی  
مجموعہ اضمداد ہے، اقبال نہیں ہے  
دل دفتر حکمت ہے، طبیعت خفقاتی  
رندی سے بھی آگاہ، شریعت سے بھی واقف  
پوچھو جو تصوف کی، تو منصور کا ثانی  
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی  
ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی  
القصہ بہت طول دیا وعظ کو اپنے  
تادیر رہی آپ کی یہ نغز بیانی  
اس شعر میں جو بات ہو، اُڑ جاتی ہے سب میں  
میں نے سنی، اپنے احبا کی زبانی  
اک دن جو سر راہ ملے حضرت زاہد  
پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی  
فرمایا، شکایت وہ محبت کے سبب تھی  
تھا فرض مرا، راہ شریعت کی دکھانی  
میں نے یہ کہا، کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے  
یہ آپ کا حق تھا زرہ قرب مکانی  
ختم ہے سر تسلیم مرا آپ کے آگے  
پیری ہے تواضع کے سبب میری جوانی



..... پیام اقبال کا ارتقا .....

گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت  
پیدا نہیں کچھ اس سے تصور ہمہ دانی  
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا  
گہرا ہے میرے بحر خیالات کا پانی  
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں  
کی اس کی جدائی میں بہت اشک نشانی  
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے  
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

”زبد اور رندی“۔ ص ۴۲

بہ ظاہر یہ ایک لطیف اور شگفتہ مکالمہ ہے، لیکن غور کیجیے تو اس کے ذریعے  
سے نوجوان شاعر نے اپنے ہم عصر نوجوانوں کو نہ صرف اپنی شخصیت و سیرت کی  
تعمیر کا ایک ہلکا سا منظر دکھایا ہے، بلکہ اُس آزاد خیالی، روشن خیالی اور کشادہ دلی کا  
ایک واضح تصور بھی اُن کے سامنے رکھ دیا ہے، جو اعلیٰ انسانی اقدار کے خلاصے اور  
جوہر کا دوسرا نام ہے۔

نوجوان اقبال جب اس جوہر طبیعت اور اس انداز تربیت سے آراستہ ہو کر  
۱۹۰۵ء میں تکمیل تعلیم کے لیے یورپ گیا تو اُسے مغرب میں اپنی فکر کو جلا دینے اور  
اپنے ذہنی افق کو وسیع تر کرنے کے بے شمار مواقع میسر آئے۔ ان کا ایک حیرت  
انگیز اثر اُس کی طبیعت پر یہ ہوا کہ وہ یورپی ممالک کی جارحانہ وطن پرستی سے بے  
زار ہو گیا اور عالم اسلام کی وحدت کا تصور اپنی پوری شدت سے اُس کے ذہن پر  
چھا گیا اور اُسے یقین کامل ہو گیا کہ ہندی مسلمان بلکہ مسلمانانِ عالم کی آزادی و  
ترقی کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ وہ پھر سے خالص اسلامی شعائر و اقدار کو زندہ کریں



اور مذہب کے رسوم و ظواہر سے نہیں بلکہ روح اسلام سے زندگی کی انفرادی فلاح اور اجتماعی کامیابی کے وہ اصول کشید کریں، جن کی صداقت پر خود گردشِ زمانہ نے بار بار اپنی مہر ثبت کی ہے۔

چنانچہ یورپ کے دورانِ قیام اقبال کے جن افکار و خیالات نے شاعری کا جامہ پہنا، وہ اکثر و بیش تر اسی تاثر کے حامل ہیں۔ پنجاب کے بابائے اردو یعنی شیخ عبدالقادر بھی ان ہی دنوں انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم کے لیے مقیم تھے، مگر وہ اقبال سے ایک سال پہلے ہندوستان واپس چلے گئے تھے۔ اُن کی واپسی کے کچھ عرصہ بعد اقبال نے انہیں ایک منظوم مراسلہ لکھا جو اُن کے مجموعہ کلام ”بانگ درا“ (صفحہ ۹۷) میں شامل ہے۔ بظاہر یہ مراسلہ ایک دوست کا خط ہے، مگر درحقیقت اُس دردِ پنہاں کا طوفان ہے، جو اُن دنوں شاعر کے دلِ دردمند میں کروٹیں لے رہا تھا۔ اقبال فرماتے ہیں۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر  
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں  
ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط  
اسی ہنگامے سے محفلِ تہِ وبالا کر دیں  
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق  
سنگِ امروز کو آئینہ فردا کر دیں  
جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو  
تپشِ آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں  
اس چمن کو سبقِ آئینِ نمو کا دے کر  
قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں



رختِ جاں بت کدہ چیں سے اٹھالیں اپنا  
سب کو محوِ رخِ سعدی و سلمیٰ کردیں  
دیکھ! میثرب میں ہوا ناقۃ لیلیٰ بیکار  
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کردیں  
بادہِ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز  
جگرِ شیشہ و پیانہ و مینا کردیں  
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیِ مغرب میں جو داغ  
چیر کر سینہ، اسے وقف تماشا کردیں  
شمع کی طرح جئیں، بزمِ عجمِ عالم میں  
خود جلیں، دیدہ اغیار کو پینا کردیں

(اشعار بانگِ درا ص ۹۷)

ہندوستان سے بڑھ کر، اب ملتِ اسلامیہ کے ایک حساس، نوجوان شاعر کے  
سینے میں جس قسم کے جذبات تلاطم برپا کر رہے تھے، یہ نظم لطیف اُن کی ہلکی سی آئینہ  
داری کرتی ہے، لیکن یہاں بھی اقبال نے خود نگری اور خود شناسی سے صرف ایک  
قدم آگے بڑھایا ہے اور اپنی بے تابوں میں محض ایک رفیقِ دورِ افتادہ کو شریک کیا  
ہے۔ اپنے ہم عصر نوجوانوں کو اُس نے اب بھی براہِ راست کوئی پیغام نہیں دیا،  
اگرچہ اپنا سینہ چیر کر دکھانے سے ایک خاموش دعوتِ ہم نفسی ضرور نمایاں ہے۔  
ایک طرف اقبال اپنے رفیقِ دورِ افتادہ کو اٹھنے اور بزم میں شعلہ نوائی سے  
اُجالا کرنے کی دعوت دے رہے ہیں تو دوسری طرف اہلِ مغرب کو اُن کی تہذیب  
کی خامیوں کے باعث براہِ راست چیلنج بھی دے رہے ہیں۔

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکان نہیں ہے

کھرا جسے تم سمجھے رہے ہو وہ اب زیرِ کم عیار ہو گا



ہیام اقبال کا ارتقا

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی  
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا  
میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے در ماندہ کارواں کو  
شرر فشاں ہو گی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہو گا

(مارچ ۱۹۰۷ء ص ۱۱۰)

پھر اقبالؒ کی شاعری کا دوسرا دور آیا، جب اقبال نے پختہ سالی کی منزل میں  
قدم رکھا اور وہ روایتی حق حاصل کیا، جس کی رُو سے شاعر یا فلسفی اپنے خیالات و  
جذبات براہِ راست اپنے مخاطبین تک پہنچا سکتا ہے۔ اقبال اس بارے میں بہت وضع  
دار تھے۔ انہوں نے اس حق کا استعمال اُس وقت تک نہیں کیا، جب تک وہ نوجوانی  
کے دائرے سے نکل کر سچے پختہ سالی کی منزل میں داخل نہیں ہو گئے۔ یہاں بھی  
اُن کے مخاطبین محض نوجوان تھے۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے ہر جگہ براہِ راست  
نوجوان کا نام لے کر اُس سے خطاب نہیں کیا، لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا  
ہے، اُن کے موضوعات میں سے کوئی موضوع ایسا نہیں، جس کا تعلق نوجوان،  
جواں مرد، مردِ جواں ہمت اور اُس کے عمل و کردار سے نہ ہو۔

اپنی معروف نظم ”خطاب بہ جوانانِ اسلام“ میں اقبال نے ایک منفیانہ  
رنگ اختیار کیا ہے۔ وہ یہاں جوانانِ اسلام کی موجودہ زبوں حالی کا تلخ جائزہ لے  
کر خاموش ہو گئے ہیں۔ ابھی اقبال نے مسلم نوجوان کو صرف نادم و شرم سار کیا  
ہے۔ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے گلے سے نہیں لگایا۔ ابھی اُس گم کردہ منزل کی  
طرف اشارہ کیا ہے، جسے از سر نو حاصل کرنا اُس کے لیے مقدر ہو چکا تھا، مگر ہمیں  
اس بات کا شدید احساس ہے کہ شاید یہ احساسِ ندامت اقبال کے مخاطب نوجوان  
کے لیے ایسا ہی ضروری تھا، جیسا اُس کے بعد پیدا ہونے والا جذبہ یقین۔ فرماتے ہیں۔



پیام اقبال کا ارتقا

کبھی اے نوجواں مسلم ! تدبیر بھی کیا ہے تو نے ؟  
 وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا  
 تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں  
 کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سر دارا  
 تمدنِ آفریں، خلاقِ آئینِ جہاں داری  
 وہ صحرائے عرب یعنی شتر بانوں کا گہوارا  
 سماں الفقرِ فخری کا رہا شانِ امارت میں  
 ”باب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیارا“  
 گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے  
 کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا  
 غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرائیں کیا تھے  
 جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا  
 اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کے الفاظ میں رکھ دوں  
 مگر تیرے تصور سے فزوں تر ہے وہ نظارا  
 تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی  
 کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا  
 گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی  
 ثریا سے زمیں پر آسمان نے ہم کو دے مارا  
 حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ ایک عارضی شے تھی  
 نہیں دنیا کے آئینِ مسلم سے کوئی چارا  
 مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی  
 جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سپارا





اقبال کی شاعری کا تیسرا دور الہامی شاعری کا دور ہے۔ اس دور میں اقبال پر یہ منکشف ہو چکا تھا کہ اُس کے وطن کے نوجوانوں پر عنقریب نیابتِ الہی کی ذمہ داریاں عائد ہونے والی ہیں۔ اپنے کلام میں وہ بار بار اس آنے والی عظمت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ خصوصاً اُن کی لازوال نظم ”طلوعِ اسلام“ جس کا نام ہی پیغمبرانہ بشارت رکھتا ہے، اس ضمن میں بہترین مثال ہے۔ یہ نظم اُن نظموں کی تمہید کہی جاسکتی ہے جن میں نوجوانوں کو براہِ راست مخاطب کیا گیا ہے۔ اس نظم کے چند اشعار بہ طور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے  
مسلمان سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے  
خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے  
یقین پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے  
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزلِ مسلمان کی  
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے  
مکانِ فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا  
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جادواں تو ہے  
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا  
تری نسبتِ براہیمی ہے، معمارِ جہاں تو ہے  
تری فطرتِ امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی  
جہاں کے جوہرِ مضر کا گویا، امتحاں تو ہے  
جہاں آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر  
نبوتِ ساتھ جس کو لے گئی، وہ ارمغان تو ہے



یہ نکتہ سرِ گذشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا  
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاساں تو ہے  
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا  
لیا جائے گا تجھ سے کام، دنیا کی امامت کا

اقبال نے اپنے تینوں تخلیقی ادوار میں، پوری شاعری میں تین بنیادی نظریات دیے ہیں، یعنی خودی، فقر اور عشق۔ یہ تین باطنی اوصاف ہیں۔ جس شخص میں یہ تینوں اوصاف بہ درجہ اتم موجود ہوں، وہ اقبال کی زبان میں ”مومن“ ہے، اور اس کی تشبیہ شاہین یا شاہباز۔ ان تین اعلیٰ، تعمیری اور مثبت اخلاقی اوصاف کے حصول میں عصرِ حاضر میں تین بڑی رکاوٹیں ہیں، جن کا ذکر اقبال بڑی دردمندی سے کرتے ہیں، یعنی سچے مذہب سے دوری، اور کفر و الحاد اور لادینیت اختیار کرنا، دوم سچے علم سے دوری اور جدید تعلیم کے مضر اثرات کا پھیلاؤ۔ سوم سچی تہذیب سے دوری۔ مغربی تہذیب اختیار کرنے کے مضر اثرات۔ ان شعبوں میں نوجوانوں کو عمل و کردار کی تلقین کے ساتھ ساتھ اقبال نے دُخترانِ ملت، اور پھر نونہالان کو بھی اُن کے ذہن و مزاج کے مطابق اپنے پیامِ خوش کلام سے نوازا ہے۔ نوجوانوں کو اسلامی نشاۃ ثانیہ اور اس سے منسلک ”اتحادِ عالمِ اسلامی“ کی اہمیت و ضرورت کے بارے میں بھی خطاب کیا ہے۔ اپنے فرزند جاوید اقبال کو مخاطب کر کے گویا پوری ملتِ اسلامیہ کی فرزندوں سے خطاب کیا گیا ہے۔

آئندہ ابواب میں ان ہی موضوعات و عنوانات کے تحت کلامِ اقبال سے ایسے اشعار کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے جو نوجوانوں کے نامِ پیام کی حیثیت بھی رکھتے ہوں اور اُن سے براہِ راست مخاطبت کا پہلو بھی رکھتے ہوں۔ گویا ان موضوعات کی نسبت سے آئندہ ابواب کے عنوان یہ ہوں گے:-



## نوجوان کے مثبت باطنی اوصاف

(۱) خودی، ایمان، یقین

(۲) فقر، غیرت

(۳) عشق، عشقِ قرآن، عشقِ رسول

(۴) مومن

(۵) شاہین

نوجوان کے منفی ظاہری اوصاف جن پر قابو پانے کی ضرورت ہے

(۶) سچے مذہب سے دوری۔ کفر و الحاد اور لادینیت کا فروغ

(۷) سچے علم سے دوری۔ جدید تعلیم کے مضر اثرات

(۸) سچی تہذیب سے دوری۔ مغربی تہذیب کے مضر اثرات

(۹) دخترانِ ملت کے نام

(۱۰) نونہالانِ ملت سے خطاب

(۱۱) اسلامی نشاتِ ثانیہ۔ عالمِ اسلام کا اتحاد

(۱۲) پیغامِ بہ ذریعہ جاوید اقبال

(۱۳) پیامِ منشور





www.KitaboSunnat.com

باب نمبر ۴

# خودی





اقبالیات کے ایک بڑے مفسر اور شارح ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اپنی تصنیف ”حکمتِ اقبال“ میں کلامِ اقبال کی روشنی میں، اقبال کے فلسفہِ خودی کی مفصل اور منظم تشریح کی ہے۔ خودی کی تعریف بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں: ”اقبال کی حکمت میں خودی سے مراد وہ شعور ہے، جو خود شناس اور خود آگاہ ہو اور اپنی ذات اور اپنے مقاصد کا احساس یا شعور رکھتا ہو، لیکن یہاں شعور کا مطلب ہوش یا تمیز نہیں، بلکہ وہ چیز ہے جس کا خاصہ ہوش یا تمیز رکھنا ہے یا جس کی وجہ سے ایک انسان تمیز یا ہوش رکھتا ہے۔ انسان میں یہی چیز ہے جو خود شناس یا خود آگاہ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ”میں“ کہتی ہے، اس لیے اقبال اس کو ”انا“ یا ”ایگو (Ego)“ یا ”من“ بھی کہتا ہے اور پھر یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے انسان زندہ ہے، اور جب مرتا ہے تو یہی وہ چیز ہے، جو اُس کے جسم سے رخصت ہو جاتی ہے۔ اس لیے اقبال اس کے لیے ”روح“ اور ”جان“ کے الفاظ بھی استعمال کرتا ہے اور اس کو ”زندگی“ اور ”حیات“ کے ناموں سے بھی تعبیر کرتا ہے۔

عقل مدت سے ہے اس پیچاک میں ابھی ہوئی

روح کس جوہر سے؟ خاک تیرہ کس جوہر سے ہے؟

زندگی بغیر شعور کے نہیں ہوتی، لہذا ان معنوں میں کہ شعور زندگی ہے، ایک خاص سطح کا شعور حیوان میں بھی موجود ہے، لیکن حیوان کا شعور آزاد نہیں، بلکہ قدرت کی پیدا کی ہوئی ناقابلِ تغیر جہتوں کے ماتحت کام کرتا ہے۔ اس کے برعکس انسان کا شعور جہتوں سے آزاد ہو کر اور اُن کی مخالفت میں بھی عمل کرتا ہے، اس لیے کہ وہ خود شناس اور خود آگاہ ہے اور اپنے مقاصد کو جانتا ہے۔ حیوان اپنے شعور کی وجہ سے فقط سوچتا، جانتا اور محسوس کرتا ہے، لیکن انسان اپنے شعور



## خودی

کی وجہ سے نہ صرف جانتا، سوچتا اور محسوس کرتا ہے، بلکہ جب وہ ایسا کرتا ہے تو وہ جانتا بھی ہے کہ وہ جانتا، سوچتا اور محسوس کرتا ہے۔ اس لیے ہم انسان کے شعور کو خود شناس اور خود آگاہ کہتے ہیں۔ اسے شعور نہیں بلکہ خود شناسی، خود شعوری یا خود آگاہی کہنا چاہیے۔ اقبال اسی کو ”خودی“ کہتا ہے۔

## خود آگاہی

”خود آگاہی“ خودی کی ایک حیرت انگیز خصوصیت ہے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے کائنات برپا ہے اور انسان کی ساری تگ و دو اور جدوجہد اسی خاصیت کی وجہ سے ہے۔ اسی کی وجہ سے خودی اپنے آپ کو آنکھوں کے بغیر دیکھتی ہے، کانوں کے بغیر سنتی ہے، بلکہ اپنے آپ کو کسی حس کی مدد کے بغیر براہ راست پوری طرح سے جانتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں ہوں، کیونکہ میں سوچ رہا ہوں، جان رہا ہوں، اور خوشی یا غم محسوس کر رہا ہوں۔ لیکن میری کوئی حس مجھے اپنے آپ کو جاننے میں مدد نہیں دے رہی۔ اگرچہ میں اپنی خودی کو آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا، لیکن اس کے باوجود ان آنکھوں کے بغیر اس طرح سے دیکھ رہا ہوں کہ میرے لیے اپنے آپ کا علم ان چیزوں کے علم سے بہ درجہ زیادہ یقینی ہے، جن کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ بلکہ میں جن چیزوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر جانتا ہوں، ان کا جانتا میرے لیے اسی وجہ سے ممکن ہے کہ میں اپنی خودی کو جانتا ہوں، کیونکہ ان کا علم وہی ہے جس کو میری خودی جانتی ہے اور میری خودی سے باہر ان کا کوئی علم نہیں، لہذا اگر میں اپنی خودی کو نہ جانوں تو دنیا کی کسی چیز کو دیکھنے کے باوجود نہیں جان سکتا۔ اگر دنیا بھر میں کسی چیز کا یقینی علم ہمیں حاصل ہے تو وہ فقط اپنی خودی کا علم ہے۔ ہم اپنی خودی کے علم سے ہی اپنے دوسرے غیر خودی کے علم کو پرکھتے ہیں۔“



خودی

خودی کا وجود فریب یا وہم نہیں

”خارج کی دنیا کے متعلق ہمارا علم قیاسی ہے اور ہمارا قیاس حواس پر مبنی ہوتا ہے۔ حواس کے تاثرات کے بدلنے سے خواہ اُس کا کوئی سبب خارج میں ہو یا نہ ہو، ہمارا علم بدل جاتا ہے۔ اس لیے کوئی شخص کائنات کے متعلق تو کہہ سکتا ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں اور زمین و آسمان درحقیقت موجود نہیں ہیں یا اُن کی حیثیت ایک ایسے خواب یا وہم سے زیادہ نہیں جو خالق کائنات کی ہستی کے لیے ایک پردے کا کام دے رہا ہے، لیکن کوئی شخص خودی کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُس کی کوئی حقیقت نہیں اور وہ ایک وہم ہے۔ خودی کا وجود محسوس دنیا، خارجی دنیا یا مادی دنیا کی چیز نہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہمارے حواس اور ہمارے قیاسات اُس کو جانتے کا وسیلہ نہیں بنتے۔“

زمان و مکاں سے بے نیازی

”اس کے باوجود کہ خودی انسان کے جسدِ عضری میں جاگزیں ہے جو سلسلہ لیل و نہار کی پابندیوں سے گھرا ہوا ہے، وہ خود زمان و مکاں کی حدود و قیود سے آزاد ہے، کیونکہ وہ اپنے خیال کے ذریعے سے ادھر ماضی اور مستقبل کی انتہاؤں تک اور ادھر کائنات کے دور دراز گوشوں تک جہاں روشنی بھی کروڑوں برس میں آتی ہے، آں واحد میں جا پہنچتی ہے۔

چونکہ ہم خودی کو کسی حالت میں بھی نہ آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں اور نہ ان آنکھوں سے چھو سکتے ہیں اور غیر کی خودی اپنی خودی نہیں ہوتی کہ ہم حواس کی مدد کے بغیر براہِ راست اسے دیکھ سکیں۔ ہم غیر کی خودی کا علم خواہ وہ خودی خدا کی ہو یا انسان کی، فقط اس کے مظاہر اور اثرات اور اعمال اور افعال کے مطالعے ہی سے حاصل کر سکتے ہیں۔“





## خودی ایک نورانی طاقت ہے

”خودی ایک نور ہے، لیکن مادی روشنیوں میں سے کوئی روشنی ایسی نہیں جو اُس کی مماثل ہو اور پھر خودی ایک قوت ہے، لیکن مادی قوتوں میں سے کوئی قوت ایسی نہیں جس کے ساتھ اُس کو مشابہت دی جاسکے۔ یہی وہ نورانی طاقت ہے، جس کا انسان میں اور دنیا کی ہر چیز میں ظہور ہے۔ یہی زندگی ہے۔“

## مشکلات پر غالب آنے کی خواہش

”لفظ خودی کی اس تشریح سے ظاہر ہے کہ اقبال نے اس لفظ کو استعمال کر کے انگریزی لفظ Self کا فارسی یا اردو ترجمہ کیا ہے، جو مدت سے فلسفہ کی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال ہو رہا ہے، لیکن افسوس ہے کہ خودی کی اس سادہ اور معروف فلسفیانہ اصطلاح کو سمجھنے میں بالعموم اقبال کے ایسے معتقدین کو بھی دقت پیش آتی ہے، جو اس کے بہت قریب رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ خودی کا لفظ اب تک فارسی اور اردو میں ایک اور معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے، یعنی خود پرستی، خود مختاری، خود سری، خود رائی، خود پسندی، خود غرضی، غرور، نخوت اور تکبر کے معنوں میں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ خود اقبال نے بھی اپنی قوم کی موجودہ حالت کے پیش نظر خودی کی گونا گوں فطری صفات میں سے اس صفت پر خاص زور دیا ہے، جس کا ایک پہلو خود نمائی ہے یا ذوقِ تفوق ہے۔

اس صفت کی رُو سے خودی ایک مقصد کا تصور کرتی ہے۔ پھر اس مقصد کے حصول کے لیے اپنی پوری قوتِ سعی و عمل صرف کرتی ہے۔ اس عمل سے اُسے اپنے مقصد میں حائل ہونے والی مخالف قوتوں پر غلبہ حاصل ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو یعنی اپنی قوتوں کا اظہار کرتی ہے اور اس خود اظہاری سے اُسے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اس بنا پر بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ خودی کی فلسفیانہ



اصطلاح روزمرہ کی زبان میں استعمال ہونے والے لفظ خودی کے ساتھ معنی کا اشتراک رکھتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال کے نزدیک جذبہ خود نمائی یا ذوق استیلا کے جائز اور ناجائز استعمال میں کوئی خاص خوبی ہے اور اقبال کی تعلیم یہی ہے کہ جس طرح سے ممکن ہو، اس جذبے کا اظہار کیا جائے۔ یہ بات قطعاً غلط ہے۔ یہاں اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے دو گزارشات ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ خودی کے مقاصد اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔ صحیح بھی ہوتے ہیں اور غلط بھی۔ جدوجہد یا عمل سے خودی کو مستقل اور مکمل اطمینان اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے، جب اُس کا مقصد اس کی فطرت کے مطابق ہو، غلط مقصد کی پیروی سے خودی کو عارضی تسلی ہو تو ہو، لیکن آخر کار اسے بے اطمینانی اور ناکامی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کی جدوجہد آخر کار خود اُس کے اندرونی فطری مقصد کو شکست دے دیتی ہے۔ اور دوسری گزارش یہ ہے کہ عمل یا جدوجہد احساسِ مذہب کا لازمی نتیجہ ہے، اور خودی ہر آن کوئی نہ کوئی مذہب (اچھا یا بُرا، صحیح یا غلط) رکھنے پر مجبور ہے، اور لہذا ہر وقت عمل یا جدوجہد کرنے پر بھی مجبور ہے۔ غلط مذہب غلط عمل پیدا کرتا ہے اور صحیح مذہب صحیح عمل پیدا کرتا ہے۔ اقبال صرف اسی عمل کی تلقین کرتا ہے جو خودی کی فطرت سے مطابقت رکھتا ہو اور صحیح ہو۔ اُس کے نزدیک صحیح مذہب اور لہذا صحیح عمل فقط ”مردِ مومن“ کا امتیاز ہے۔ گویا اقبال نے جو عملی جدوجہد اور خود نمائی پر زور دیا ہے، اُس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ ہم اپنے مقصد یا مذہب کو درست کریں۔ اسی کو وہ یقین محکم یا ایمان کہتا ہے۔ اگر مذہب ناقص سے پاک اور شکوک و شبہات سے آزاد ہو کر درست ہو جائے تو وہ ایک طاقت ور عزم یا ارادہ عمل بن جاتا ہے۔“

## اقبال کی وضاحت

اقبال نے خود اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ خودی سے اُس کی مراد



خودی

تکبر یا غرور نہیں۔ ”اسرارِ خودی“ کے دیباچے میں اُس نے لکھا ہے: ”ہاں لفظ خودی کے متعلق ناظرین کو آگاہ کر دینا ضروری ہے کہ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی مغرور استعمال نہیں کیا گیا، جیسا کہ عام طور پر اردو میں مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا یقینِ ذات ہے۔“

قاضی نذیر احمد کے نام اپنے مکتوب میں اقبال نے لکھا ہے: ”اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی دونوں کا موضوع یہی مسئلہ خودی ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے آپ کو اطمینان ہو جائے گا۔ اگر ان دونوں میں یا میری کسی اور کتاب میں آپ کو کوئی ایسا شعر ملے، جس میں خودی کا مفہوم تکبر یا غرور یا نخوت لیا گیا ہو تو اس سے مجھے آگاہ کیجیے۔“

نیٹھے پر اقبال کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نوٹ ”اقبال اکادمی“ کے پاس محفوظ ہے۔ اس نوٹ میں لفظ خودی کی تشریح کرتے ہوئے اقبال نے لکھا ہے: ”لفظ خودی کو بڑی مشکل سے اور بادلِ خواستہ چٹا گیا ہے۔ ادبی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس کے اندر بہت سی خامیاں ہیں۔ اور اخلاقی نقطہ نظر سے اسے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ہمیشہ برے معنوں میں ہی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ دوسرے الفاظ بھی، جو ”میں“ کی مابعد الطبیعیاتی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیے جاسکتے ہیں، اتنے ہی ناموزوں ہیں مثلاً انا، شخص، نفس، انانیت۔

ضرورت دراصل اس بات کی ہے کہ ”میں“ یا ”ایگو“ کے لیے ایک ایسا لفظ مل جائے جو بے رنگ ہو اور کسی اخلاقی مفہوم کے بغیر ہو۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، فارسی یا اردو میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں۔ فارسی لفظ ”من“ بھی اتنا ہی ناموزوں ہے۔ تاہم شعر کی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے سمجھا کہ لفظ ”خودی“ سب سے زیادہ موزوں ہے۔ فارسی زبان میں کسی قدر اس بات کی



### خودی

شہادت بھی موجود ہے کہ لفظ خودی ایغو کے سادہ مفہوم یعنی ”من“ کے بے رنگ معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ گویا مابعد الطبیعیاتی نقطہ نظر سے خودی کا لفظ ”من“ کے اس ناقابل بیان احساس کے لیے استعمال کیا گیا ہے، جو ہر فرد انسانی کی بے مثل انفرادیت کی بنیاد ہوتا ہے۔ مابعد الطبیعیاتی طور پر اس لفظ کا کوئی مفہوم ایسے لوگوں کے لیے نہیں جو اُس کے اخلاقی مفہوم سے نجات نہیں پاسکتے۔ میں ”زبور عجم“ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔

گر فتم ایں کہ شرابِ خودی بے تلخ است  
بدر و خویشِ گمر، زہرِ ما بدرمان کش  
(ترجمہ: خودی کی شراب بے شکر تلخ ہے، لیکن اپنے مرض پر نگاہ رکھو اور اپنی صحت کی خاطر میرے زہر کو پی لو)

جب میں فقی خودی کی مذمت کرتا ہوں تو مطلب اس سے اخلاقی معنوں میں ایثار یا نفس کشی کی مذمت نہیں ہوتا۔ فقی خودی کی مذمت سے میں ایسے افعال کی مذمت کرتا ہوں، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ”میں“ کو ایک مابعد الطبیعیاتی قوت کی حیثیت سے منادیا جائے، کیونکہ اُسے مٹانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اجزا بکھر جائیں۔ وہ حیات بعد ممات کے قابل نہ رہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اسلامی تصوف کا نصب العین خودی کو مٹانا نہیں۔ اسلامی تصوف میں فنا سے مراد انسانی ایغو کا مٹانا نہیں بلکہ اس کا مکمل طور پر خدا کی ذات کے سپرد کر دینا ہے۔ اسلامی تصوف کا نصب العین ایک ایسا مقام ہے، جو فنا کے مقام سے بھی آگے ہے یعنی مقام بقا، جو میرے نقطہ نظر سے اثباتِ خودی کا بلند ترین مقام ہے۔ جب میں کہتا ہوں ”لعل کی طرح سخت ہو جاؤ“ تو میری مراد بیٹھے کی طرح یہ نہیں ہوتی کہ بے رحم اور بے درد ہو جاؤ، بلکہ یہ ہوتی ہے کہ خودی کے عناصر کو مجتمع کرو، تاکہ وہ بعد از مرگ زندہ رہنے



## خودی

کے لیے فنا کا مقابلہ کر سکے۔

اخلاقی نقطہ نظر سے لفظ خودی (جیسا کہ اسے میں نے استعمال کیا ہے) کا مطلب ہے خود اعتمادی، خود داری، اپنی ذات پر بھروسہ، حفاظتِ ذات، بلکہ اپنے آپ کو غالب کرنے کی کوشش، جیسا کہ ایسا کرنا زندگی کے مقاصد کے لیے اور صداقت، انصاف اور فرض کے تقاضوں کو پورا کرنے کی قوت کے لیے ضروری ہو۔ اس قسم کا کردار میرے خیال میں اخلاقی ہے، کیونکہ وہ خودی کو اپنے قویٰ کے مجتمع کرنے میں مدد دیتا ہے اور اس طرح تحلیل اور انتشار کی قوتوں کے خلاف خودی کو سخت کر دیتا ہے۔ عملی طور پر مابعد الطبیعیاتی ایغودو بڑے حقوق کا علم بردار ہے۔ اول زندہ رہنے کا حق اور دوم آزاد رہنے کا حق، جیسا کہ خداوندی قانون نے مقرر کیا ہو۔“

خودی کی تعریف و تشریح کے بعد اب یہاں کلامِ اقبال سے خودی کے موضوع پر ایسے اشعار کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جن کا تعلق نوجوانوں اور اُن کی بہبود و ترقی سے ہے۔ پہلے اُردو کلام سے، پھر فارسی کلام سے انتخاب پیش کیا جائے گا۔

تو رازِ کن نکال ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا

خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجمان ہو جا

ہوس نے کر دیا ہے، نکلے نکلے نوعِ انساں کو

اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی

تو اے شرمندہٴ ساحل، اچھل کر بیکراں ہو جا



خودی

غبارِ آلودہ رنگ و نسب ہیں، بال و پر تیرے  
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا  
خودی میں ڈوب جا غافل، یہ سرِ زندگانی ہے  
نکل کر حلقہٴ شام و سحر سے جادواں ہو جا  
مصافِ زندگی میں سیرتِ فوئاد پیدا کر  
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا  
گزر جا بن کے سیلِ شندِ رَو کوہِ بیاباں سے  
گلستاںِ راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ہا سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا  
غلط تھا اے جنوں شاید ترا اندازہٴ صحرا  
خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں  
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا، نہ میں سمجھا  
نگہ پیدا کر اے غافل، تجلی عینِ فطرت ہے  
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا  
رقابتِ علم و عرفاں میں غلط بینی ہے منبر کی  
کہ وہ حلاج کی سولی کو سمجھا ہے رقیب اپنا  
خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں، غلامی میں  
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا



خودی

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی  
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

وہ حرف راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں  
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں  
ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا  
وہ خود فراخی افلاک میں ہے خوار و زبوں  
حیات کیا ہے؟ خیال و نظر کی مجذوبی  
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گونا گوں  
عجب مزا ہے، مجھے لذتِ خودی دے کر  
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں  
ضمیر پاک و نگاہ بلند و مستی شوق  
نہ مال و دولتِ قاروں، نہ فکرِ افلاطوں  
سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے  
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں  
یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید  
کہ آرہی ہے دما دم صدائے ”کن فیکوں“  
علاجِ آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا  
ترمی خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں



خودی

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن  
اسی کے فیض سے میرے سبب میں ہے جیوں۔

خودی کی شوقی و تندی میں کبر و ناز نہیں  
جو ناز ہو بھی، تو بے لذت نیاز نہیں  
نگاہِ عشقِ دلِ زندہ کی تلاش میں ہے  
شکارِ مُردہ سزاوارِ شاہباز نہیں  
ہوئی نہ عام جہاں میں کبھی حکومتِ عشق  
سبب یہ ہے کہ محبتِ زمانہ ساز نہیں  
اک اضطرابِ مسلسلِ غیاب ہو، کہ حضور!  
میں خود کہوں تو مری داستانِ دراز نہیں  
اگر ہو ذوقِ تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم  
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں۔

خودی ہے وہ بحرِ جس کا کوئی کنارہ نہیں  
تو آجیو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں  
خودی میں ڈوبتے ہیں، پھر ابھر بھی آتے ہیں  
مگر یہ حوصلہٴ مردِ بیچ کارہ نہیں

۱۔ حکیم سنائی غزنوی کے مزار پر (بانگلہ درہ ..... ۲۵۷)

۲۔ غزل نمبر ۱۵ (بال جبریل ..... ۲۶۵)





خودی

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے  
کہ خاکِ زندہ ہے تو تلخ ستارہ نہیں  
میں بہشت بھی ہے، حور و جبریل بھی ہے  
تری نگہ میں ابھی شوخیِ نظارہ نہیں ۱

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی  
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقامِ پادشاہی  
تری زندگی اسی سے، تری آبرو اسی سے  
جو رہی خودی تو شاہی، نہ رہی تو رو سیاہی ۲

تری نگاہِ فردِ مایہ، ہاتھ ہے کوتاہ  
ترا گنہ کہ نخیلِ بلند کا ہے گناہ  
گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا  
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

خودی میں گم ہے، خدائی تلاش کر غافل  
یہی ہے تیرے لیے اب صلاحِ کار کی راہ  
حدیثِ دل کسی درویش بے گیم سے پوچھ  
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ!

۱۔ غزل ۲۱ (بالِ جبریل..... ۲۷۰)

۲۔ غزل ۲۲ (بالِ جبریل..... ۲۷۱)



خودی

برہنہ سر ہے تو عزم بلند پیدا کر  
یہاں فقط سر شاین کے واسطے ہے گماہ  
نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازی افلاک  
خودی کی موت ہے تیرا زوال نعمت و جاہ !  
اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غم ناک  
نہ زندگی، نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ لے

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں  
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں  
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا  
حیات ذوق سفر کے سوا، کچھ اور نہیں  
گراں بہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ  
گہر میں آبِ گہر کے سوا، کچھ اور نہیں ۲

یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی!  
یا بندہ خدا بن یا بندہ زمانہ  
غافل نہ ہو خودی سے کر اپنی پاسبانی  
شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ

۱۔ غزل ۲۳ (بال جبریل ..... ۲۷۲)

۲۔ غزل ۲۴ (بال جبریل ..... ۲۷۲)



خودی

اے لا الہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں  
گفتارِ دلبرانہ، کردارِ قاہرانہ

تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے  
کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ  
رازِ حرم سے شاید اقبال با خبر ہے  
پس اس کی گفتگو کے اندازِ محرمانہ

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے  
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے  
نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں  
نہ پوچھ اے ہم نشیں مجھ سے، وہ چشمِ سُرماسا کیا ہے ۲

فطرت کو خرد کے روبرو کر  
تسخیرِ مقامِ رنگ و بو کر  
تو اپنی خودی کو کھوچکا ہے  
کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر

۱۔ غزل ۳۲ (بالِ جبریل ..... ۲۷۸)

۲۔ غزل ۳۳ (بالِ جبریل ..... ۲۷۹)



خودی

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت  
جو اُس سے نہ ہو سکا، وہ تو کرا

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل  
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل  
عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں  
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل  
نظر نہیں تو مرے حلقہٴ سخن میں نہ بیٹھ  
کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تنغِ اصیل  
اندھیری شب ہے، جدا اپنے قافلے سے ہے تو  
ترے لیے ہے مرا شعلہٴ نوا قدیل  
غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم  
نہایت اس کی حسینؑ، ابتدا ہے اسماعیلؑ

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا  
مقامِ رنگ و بو کا راز پا جا

۱۔ غزل ۳۷ (بال جبریل..... ۲۸۲)

۲۔ غزل ۳۲ (بال جبریل..... ۲۸۵)



خودی

برنگِ بحر، ساحل آشنا رہ  
کفِ ساحل سے دامن کھینچتا جا لے

حکیمی نا مسلمانِ خودی کی  
کلیسی رمز پنہانی خودی کی  
تجھے گر فقر و شاهی کا بتا دوں  
غریبی میں نگہبانی خودی کی

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے  
خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے  
خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات  
خودی کیا ہے؟ بیداری کائنات  
خودی جلوہ بدست و خلوت پسند  
سمندر ہے اک بوندِ پانی میں بند  
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک  
من و تو میں پیدا، من و تو سے پاک  
ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے  
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

۱۔ رباعی (بال جبریل..... ۳۰۳)

۲۔ رباعی (بال جبریل..... ۳۰۶)



خودی

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی  
 ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی  
 تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی  
 دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی  
 سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں  
 پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں  
 سفر اس کا انجام و آغاز ہے  
 یہی اس کی تقویم کا راز ہے  
 کرن چاند میں ہے، شرر سنگ میں  
 یہ بے رنگ ہے، ڈوب کر رنگ میں  
 اسے واسطہ کیا کم و بیش سے  
 نشیب و فراز و پس و پیش سے  
 ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر  
 ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر  
 خودی کا نشین ترے دل میں ہے  
 فلک جس طرح آنکھ کے تِل میں ہے۔

خودی

زمانے میں جھوٹا ہے اس کا نگین  
جو اپنی خودی کو پرکھتا نہیں  
بتانِ شعوب و قبائل کو توڑ  
رسومِ کہن کے سلاسل کو توڑ  
یہی دینِ محکم، یہی فتحِ یاب  
کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

جرات ہے تو افکار کی دنیا سے گزر جا  
ہیں بحرِ خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے  
کھلتے نہیں اس قلمِ خاموش کے اسرار  
جب تک تو اسے ضربِ کلیسی سے نہ چیرے

خودی کا سر نہاں، لا الہ الا اللہ  
خودی ہے تنقِ فساں، لا الہ الا اللہ  
یہ دور اپنے برائیم کی تلاش میں ہے  
ضمِ کدہ ہے جہاں، لا الہ الا اللہ

۱۔ پنجاب کے دہقان سے (بال جبریل..... ۳۶۳)

۲۔ ماہر نفسیات (بال جبریل..... ۳۷۶)



37

خودی

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا  
 قریب سود و زیاں، لا الہ الا اللہ  
 یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند  
 بھان و ہم و گماں، لا الہ الا اللہ  
 خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زنجاری  
 نہ ہے زمان نہ مکاں، لا الہ الا اللہ  
 یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند  
 بہار ہو کہ خزاں، لا الہ الا اللہ  
 اگر چہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں  
 مجھے ہے حکمِ اذان، لا الہ الا اللہ

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود  
 مری نگاہ میں ثابت نہیں وجودِ ترا  
 وجود کیا ہے؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود  
 کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمودِ ترا ۲

۱۔ لا الہ الا اللہ (ضربِ کلیم ..... ۳۹۵)

۲۔ افرنگِ زدہ (ضربِ کلیم ..... ۳۱۱)



خودی

اے پیر حرم، رسم و رہ خاقی چھوڑ  
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا  
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت  
دے ان کو سبق خود شکنی، خود نگری کا  
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے  
مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا  
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی  
دارو کوئی سوچ ان کی پریشان نظری کا  
کہہ جاتا ہوں زور جنوں میں ترے اسرار  
مجھ کو بھی صلہ دے میری آشفہ سری کا

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی  
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد  
ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے  
وہ عالم مجبور ہے، تو عالم آزاد  
موجوں کی تپش کیا ہے؟ فقط ذوقِ طلب ہے  
پنہاں جو صدف میں ہے، وہ دولت ہے خداداد

۱۔ اے پیر حرم (ضربِ کلیم.....۴۳۱)

۲۔ اسرارِ پیدا (ضربِ کلیم.....۴۴۲)



خودی

نہ میں انجی، نہ ہندی، نہ عراقی و حجازی  
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی  
تو مری نظر میں کافر، میں تری نظر میں کافر  
ترا دیں نفس شماری، مرا دیں نفس گدازی!۱

جہاں تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود  
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا  
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے  
اس آج سے کیے، بحر بیکراں پیدا  
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے  
جو ہر نفس سے کرے عمر جاوداں پیدا  
خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں  
ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا  
ہوئے دشت سے ہوئے رفاقت آتی ہے  
عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہم عنان پیدا۲

تری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود  
حیات کیا ہے؟ اسی کا سرور سوز و ثبات

۱۔ غزل ضرب کلیم (ضرب کلیم ۳۴۳)

۲۔ تخلیق (ضرب کلیم ۳۶۴)



خودی

بلند تر مہ و پرویں سے ہے اسی کا مقام

اسی کے نور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات

حریم تیرا خودی غیر کی! معاذ اللہ!

دوبارہ زندہ نہ کر کاروبارِ لات و منات

یہی کمال ہے تمثیل کا کہ تو نہ رہے

رہا نہ تو، تو نہ سوزِ خودی، نہ سازِ حیات لے

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ

میں جانتا ہوں، وہ آتشِ ترے وجود میں ہے

تری دوا نہ جینوا میں ہے، نہ لندن میں

فرنگ کی رگِ جاں، منجہٗ یہود میں ہے

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات

خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے لے

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی

مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا

عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

۱۔ تیار (ضربِ کلیم..... ۲۶۸)

۲۔ فلسطینی عرب سے (ضربِ کلیم..... ۵۱۵)



خودی

وہی شراب، وہی ہائے و ہو رہے باقی  
طریق ساقی و رسم کدو بدل جائے  
تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری  
مری دعا ہے، تری آرزو بدل جائے ۱

رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان  
تو بھی اے فرزندِ کہستان، اپنی خودی پہچان

اپنی خودی پہچان  
او غافل افغان

موسم اچھا، پانی دافر، مٹی بھی زرخیز  
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا، وہ کیسا دھقان

اپنی خودی پہچان  
او غافل افغان

اوچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا  
جس کی ہوائیں تند نہیں ہیں، وہ کیسا طوفاں

اپنی خودی پہچان  
او غافل افغان

ڈھونڈ کے اپنی خاک میں جس نے پایا اپنا آپ  
اس بندے کی دھقانی پر سلطانی قربان

۱۔ محراب گل افغان کے انکار (ضربِ کلیم..... ۵۱۹)



خودی

اپنی خودی پہچان  
او غافل افغان

تیری بے علمی نے رکھ لی، بے علموں کی لاج  
عالم فاضل بچ رہے ہیں، اپنا دین ایمان

اپنی خودی پہچان  
او غافل افغان

مجھ کو تو یہ دنیا نظر آتی ہے دگرگوں

معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا

ہر سینے میں اک صحیح قیامت ہے نمودار

افکار جوانوں کے ہوئے زیر و زبر کیا

کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی!

اے پیر حرم، تیری مناجات سحر کیا؟

ممکن نہیں تخلیق خودی خاتموں سے

اس شعلہ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا



۱۔ محراب گل افغان کے افکار (ضرب کلیم ..... ۵۲۱)

۲۔ محراب گل افغان کے افکار (ضرب کلیم ..... ۵۲۵)



خودی

خودی ہے زندہ تو ہے موت اک مقامِ حیات  
کہ عشقِ موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات  
خودی ہے زندہ تو دریا ہے بیکرانہ ترا  
ترے فراق میں مضطر ہے موجِ نیل و فرات  
خودی ہے مردہ تو مانندِ کاہِ پیشِ نسیم  
خودی ہے زندہ تو سلطانِ جملہ موجودات ۱

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟  
خودی تری مسلمان کیوں نہیں ہے؟  
عبث ہے شکوہِ تقدیرِ یزداں  
تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟ ۲

کبھی دریا سے مثلِ موج ابھر کر  
کبھی دریا کے سینے میں اتر کر  
کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر  
مقامِ اپنی خودی کا فاش تر کر ۳

۱۔ مسعود مر حوم (ارمغانِ حجاز..... ۵۵۰)

۲۔ رباعی (ارمغانِ حجاز..... ۵۵۵)

۳۔ رباعی (ارمغانِ حجاز..... ۵۵۵)



خودی

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا  
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں  
کمالِ صدق و مروت ہے زندگی ان کی  
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تفسیریں  
قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال  
یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں  
خودی سے مردِ خود آگاہ کا جمال و جلال  
کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں ۱

اقبال کا فارسی کلام اُن کے فلسفہِ خودی سے بھرا پڑا ہے۔ خاص طور پر مثنوی  
”اسرار و رموز“ تو فلسفہِ خودی ہی کی تشریح ہے، اور اس فلسفے کا خلاصہ انہوں نے اپنی  
نظم ”بابائے صحرائی کی نصیحت“ میں کر دیا ہے۔ یہ نصیحت نوجوانوں کے نام ہے۔ بابائے  
صحرائی کے پردے میں خود علامہ اقبال جلوہ گر ہیں۔ ”اسرار و رموز“ کا منظوم ترجمہ  
”ترجمانِ اسرار“ کے نام سے جسٹس ایس اے رحمن (مرحوم) نے کیا ہے اور انتہائی درد  
مندی اور مہارت سے کیا ہے۔ یہاں ”بابائے صحرائی کی نصیحت“ جسٹس صاحب کے  
ترجمے کے ساتھ پیش کی جا رہی ہے:

تو اے جو پھول کی مانند مٹی سے پھلا پھولا  
ہوا بطنِ خودی سے تو ریاضِ دہر میں پیدا  
نہ کر ترکِ خودی ہر گز، بقا انجام ہو کر رہ  
جو قطرہ ہو کے رہتا ہے تو بحرِ آشام ہو کر رہ

۱۔ ملا زادہ ضیغم لولائی کشمیری کی بیاض (ارمخان حجاز..... ۵۶۳)



— خودی —

خودی کے نور سے ہوتی ہے ہستی تیری تابندہ  
خودی محکم اگر کر لے تو ہو جائے تو پائندہ

یہ سودا فائدے کا ہے، نہ اس سودے سے ہو غافل  
یہ وہ دولت ہے جس سے تجھ کو ہو گی خواہجگی حاصل  
اگر زندہ ہے تو، کیوں نیستی سے ڈرتا رہتا ہے  
ترے قرباں غلط سمجھا ہے تو جو کچھ بھی سمجھا ہے

حقیقت مجھ پر روشن ہے کہ سازِ زندگی کیا ہے؟

ادھر آ میں بتاؤں تجھ کو رازِ زندگی کیا ہے؟

خود اپنے آپ ہی میں غوطہ زن مثلِ گہر ہونا  
ابھر کر اپنی خلوت گاہ سے آتشِ نظر ہونا  
دلی چنگاریوں کو راکھ کی ذہیری میں بھڑکانا  
جو نظروں کو جلا دے ایسا شعلہ زار بن جانا

چہل سالہ مصیبت کا گھر وندا پھونک کر رکھ دے

تو بن کہ شعلہٴ جوالہ اپنے گرد چلے لے

جو طوفانِ غیر ہی کو موت گردانے، وہ زندہ ہے

وجود اپنے کو جو بیتِ الحرم جانے، وہ زندہ ہے

پروں کو پھڑ پھڑا کر تو نکل مٹی کے پھندے سے

پرندوں کی طرح محفوظ ہو گرنے کے خدشے سے





— خودی —

اگر طائر نہیں ہے تو، نہ کر پھر امتحان اپنا  
 دہان غار پر ہر گز بنا مت آشیاں اپنا  
 تری خواہش ہے باغِ علم کے سب پھول تو جن لے  
 پیامِ پیرِ رومی گوشِ دل سے تو مگر سن لے  
 نہیں افعی سے کم وہ علم جو بس تن کے کام آئے  
 ترا ہدم بنے گا علم اگر وہ دل کو گرمائے  
 تجھے معلوم ہے یہ داستانِ اُستادِ رومی کی  
 کہ جس کی درس گہ شہرِ حلب میں علم پرور تھی  
 پڑی عقلی دلیلوں کی تھی پیڑی اُس کے پاؤں پر  
 پھنسی تھی اس کی کشتی عقل کے گرداب میں آکر  
 وہ موسیٰؑ تھا مگر بیگا نہ سینا ئے محبت سے  
 نہ اس کو عشق سے مس تھا نہ سودائے محبت سے  
 فلک پر کبھی اشراق پر اصرار ہوتا تھا  
 ہر اک موضوع پر حکمت کے موتی وہ پروتا تھا  
 وہ سلجھاتا تھا اکثر قولِ مشائخ کے عقدے  
 اُجاگر اُس کے نورِ فکر سے اسرار تھے سارے

کتابوں کے ذخیروں میں سدا محصور رہتا تھا  
 نشے میں شرحِ اسرارِ کتب کے پور رہتا تھا  
 اشارہ ہو گیا جب پیرِ تبریزی کو مرشد کا  
 جلال الدین کے مکتب کا اُس نے رُخ کیا سیدھا



— خودی —

کہا یہ شور و غوغا اور یہ قیل و قال کیسے ہیں؟  
خدا را یہ قیاس و وہم و استدلال کیسے ہیں؟

کہا یوں مولوی نے ڈانٹ کر: خاموش اے ناداں  
خردمندوں کی باتوں پر ہنسی تجھ کو نہیں شایاں  
پرے ہٹ، دور ہو جا میرے مکتب سے اودیوانے  
ترا کیا کام ہے اس سے، تو قیل و قال کیا جانے؟

ہماری گفتگو تیری سمجھ کی حد سے باہر ہے  
اسی کے نور سے ادراک کا شیشہ متور ہے  
بڑھایا سوزِ شمس ان بے طرح باتوں نے ملا کی  
بھڑک اٹھی غضب کی آگ سے تب روح تبریزی

زمین پر اس کی نظروں نے گرائے برق کے پارے  
نمایاں اس کے سوزِ دم سے مٹی میں ہوئے شعلے  
جلایا خرمنِ ادراک یکسر دل کی آتش نے  
کیا سب فلسفے کا پاک دفتر دل کی آتش نے

وہ ملّا عشق کے اعجاز سے واقف نہ تھا اب تک  
وہ سازِ عشق کے نغموں سے تھا نا آشنا اب تک

پکار اٹھا: ”یہ شعلہ کس طرح بھڑکا دیا تو نے  
کہ جس سے دفترِ حکمت کو خاکستر کیا تو نے“

کہا یوں شیخ نے: ہے مسلم زقارِ بستہ تو  
یہ ذوقِ د حال ہے، خاموش رہ، لے اپنا رستہ تو



— خودی —

ترے فکر و تخیل سے ہمارا حال ہالا ہے

جو مس کو زر کرے وہ کیمیا شعلہ ہمارا ہے

ترے سرمایہ کو ہے برفِ حکمت سے ملا گس بل

فقط اولے ہی برساتا ہے تیرے فکر کا بادل

اُٹھ اپنے ہی خس و خاشاک سے آتشِ فروزاں کر

تو اپنی خاک کے ہر ذرہ کو شعلہ بداماں کر

نہ ہو گر سوئے دل، مسلم نہیں ہے علم میں کامل

یہی ہے معنیِ اسلام، تو ہو تارکِ آفل

جو ابراہیم نے پائی رہائی بندِ آفل سے

نہ اس کا بال بیکا کر سکے نمرود کے شعلے

لگنِ باطل کی ہے تجھ کو، تو علمِ حق کو بھولا ہے

فقط روٹی کی خاطر نقدِ دیں کو ٹوٹنے بیچا ہے

تو سرگردانِ آوارہ ہوا ہے دُھن میں سرے کی

نہاں ہے تیری نظروں سے مگر چشمِ سیہ تیری

تمنا کر کہ تجھ کو آبِ حیاں دے دمِ خنجر

تو خواہاں ہو کہ تجھ کو سانپ کے مُنہ سے ملے کوثر

طلب کر سنگِ اسود تو درِ بت خانہ سے جا کر

طلب کر مشک کا نائفِ سبِ دیوانہ سے جا کر

نہ لیکن ڈھونڈھ سوئے عشقِ ہر گز علمِ حاضر سے

ملے گا کیفِ حق کا جام کیا اس پختہ کافر سے

مجھے آوارہ رکھا ایک مدتِ علم کی لُونے

بنایا محرمِ راز اپنا مجھ کو دانشِ نُونے



خودی

چمن والوں نے میرا امتحاں کر کے مجھے پرکھا  
 کیا ہراز مجھ کو تب اُنھوں نے اس گلستاں کا  
 نہیں گلشن، حقیقت میں یہ لالہ زار عبرت ہے  
 گل کاغذ کی صورت یہ سراپ رنگ و نکبت ہے  
 ہوا ہوں قید سے اس گلستاں کی میں رہا جب سے  
 بنا ہے آشیانہ شاخِ طوبیٰ پر مراتب سے  
 نظر کے واسطے ہے علمِ نو سب سے بڑا پردہ  
 ہے اس کا بُت پرستی، بُت فروشی، بت گری شیوہ  
 پڑی ہے پاؤں میں اس کے مظاہر کی کڑی پیڑی  
 حدودِ حس سے یہ نکلے، نہیں تدبیر کچھ اس کی  
 گرا یوں راہِ ہستی میں، اسے جینا ہوا دُور  
 خود اپنے ہی گلے پر اس نے آخر رکھ دیا خنجر  
 نہیں ہے اس کی آتش میں حرارتِ لالہ کی صورت  
 بظاہر شعلہ رکھتا ہے، خنک ہے ژالہ کی صورت

رہی آزاد فطرت اس کی سوزِ عشق سے یکسر  
 جہانِ جستجو میں ہے یہ ناکامی کا نوحہ گر  
 خرد کے عارضوں کا عشقِ افلاطون ہوتا ہے  
 اُترتا ہے جنوں اس کا، یہ جب نشتر چھوٹا ہے



خودی

وہیں سجدے کرے عالم جہاں پر عشق فرمائے  
یہ وہ محمود ہے جو سوماتِ عقل کو ڈھائے  
رہی خالی صراحیِ علمِ نو کی عشق کی مئے سے  
نہ راتیں آشنا اُس کی ہوئیں فریاد کیلے سے

رہی کم تیری نظروں میں ترے شمشاد کی قیمت  
عطا کی دوسروں کے سرو کو تو نے مگر رفعت  
مثال لے خود اپنے آپ کو تو نے کیا خالی  
بنایا تو نے دل اپنا نوائے غیر کا حالی  
تو خوانِ غیر سے ہے ایک ریزہ مانگتا پھرتا  
تو غیروں کی دکان سے جنس اپنی کا ہوا جویا  
جل اٹھی بزمِ مسلم کی چراغِ غیر سے آخر  
لگی آگ اس کی مسجد کو شرابِ دیر سے آخر  
حرم کی سرزمین سے جب نکل کر آگیا آہو  
ہوا صیاد کے تیروں سے چھلنی اُس کا پھر پہلو  
پریشاں مثلِ بوہیں پتیاں گل کی، چمن اُجڑا  
خودی سے بھاگنے والے پھر اپنی سمت واپس آ  
امانت دی گئی تجھ کو کتابِ پاک کی حکمت  
کہیں سے ڈھونڈ لا اپنی وہی کھوئی وحدت



خودی

حصارِ عافیت ملت ہے، ہم ملت کے ہیں درباں  
 ہوئے ترکِ شعار قوم سے ہم تارکِ ایمان  
 ہوا ہے کلڑے کلڑے ساقیِ دیرینہ کا ساغر  
 پریشاں بزمِ رندانِ حجازی ہو گئی یکسر  
 بتوں سے کعبہ کو آباد رکھنا کام ہے اپنا  
 ہنسی جس کی اڑائے کفر وہ اسلام ہے اپنا  
 محبت میں بتوں کی شیخ نے اسلام ہارا ہے  
 جو سلکِ سجدہ لازم ہو، اُسے زقار پیارا ہے  
 سفیدی نے سروں کی ہے بنایا چیر چروں کو  
 ملا موقعِ ہنسی کا ہر گلی کوچہ کے بچوں کو  
 ہوئے ہیں لا الہ کے نقش سے دل اُن کے بیگانے  
 ہوس کی مورتوں سے ہو گئے آباد بت خانے

ہوا ہر مَو دراز اب طاقِ طرزِ خرقہ پوشی میں  
 کیا ہے نام ان سودا گروں نے دیں فروشی میں  
 سفر میں رات دن رہتے ہیں ساتھ اپنے مریدوں کے  
 وہ ہیں نا آشنا ملت کی ہر ادنیٰ ضرورت سے  
 نہیں ہے نور کوئی مثلِ نرگس اُن کی آنکھوں میں  
 دلِ زندہ کی دولت کی کمی ہے اُن کے سینوں میں



خودی

مگن منصب پرستی میں ہوئے سب واعظ و صوفی  
 نہیں ہے اعتبار اب ملتِ بیضا کا کچھ باقی  
 لگی ہے آنکھ داعظ کی صنم خانے کے منظر پر  
 بنا ہے مفتی دینِ مبیں، فتوؤں کا سوداگر  
 کیا ہے رُخ ہمارے پیر نے مے خانے کا سیدھا  
 بتاؤ ہمدومو تم ہی کہ ہو تدبیر اپنی کیا؟





## باب نمبر ۵

# فقر







— فقر —

فقر در حقیقت خودی کا ایک ذیلی اخلاقی وصف ہے۔ اقبال کے ہاں یہ اصطلاح مفلسی، فقیری یا گداگری کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوئی، بلکہ مشہور حدیث نبوی ﷺ ”الْفَقْرُ فَخْرِي“ (فقر میرا فخر ہے) کے مفہوم میں استعمال ہوئی ہے۔ فقر کے معنی یہ ہیں کہ دل کو دنیا سے الگ رکھنا، باہمہ و بے ہمہ رہنا، دنیا کی کسی شے سے محبت نہ رکھنا، دنیا میں کسی چیز کی طلب نہ رکھنا سوائے سوئے دل کے۔ نعمتیں، آسائشیں اور اسباب کی فراوانی انسان کو اندھا بنا دیتی ہیں۔ اُس کے دل میں سوئے قلب نہیں رہتا۔ وہ دنیوی علاقے میں اس قدر پھنس جاتا ہے کہ پھر اُسے اپنی روح کی پرورش کی فکر نہیں رہتی۔ اسی لیے اقبال نوجوانوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ وہ خواہ کتنے ہی اعلیٰ مناصب و مراتب پر کیوں نہ پہنچ جائیں، لیکن دل درویش رہنا چاہیے۔

تمنا درِ دل کی ہو تو خدمت کر فقیروں کی  
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں  
نہ پوچھ ان خرقة پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو  
پد بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنے آستینوں میں

سماں اَلْفَقْرُ فَخْرِي کا رہا شانِ امارت میں  
باب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را  
گدائی میں بھی وہ اللہ کے والے تھے غیور اتنے  
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

۱۔ غزل (بانگ درا..... ۷۸)

— فقر —

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرائیں کیا تھے  
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا ۱

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا  
یہ سپہ کی تیغ بازی، وہ ننگہ کی تیغ بازی ۲

نہ ایراں میں رہے باقی، نہ توراں میں رہے باقی  
وہ بندے فقر تھا جن کا ہلاک قیصر و کسریٰ ۳

گو فقر بھی رکھتا ہے اندازِ ملوکانہ  
ناپختہ ہے پرویزی، بے سلطنتِ پرویز  
اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی  
خونِ دل شیراں ہو، جس فقر کی دستاویز ۴

۱۔ خطاب بہ جوانانِ اسلام (بانگ درا..... ۱۳۰)

۲۔ غزل نمبر ۱۳ (بالِ جبریل..... ۲۳۹)

۳۔ نادر شاہ غازی (بالِ جبریل..... ۲۵۴)

۴۔ نادر شاہ (بالِ جبریل..... ۲۵۶)



فقیر

میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا  
تمھارا فقر ہے بے دہشتی و رنجوری  
نہ فقر کے لیے موزوں، نہ سلطنت کے لیے  
وہ قوم جس نے گنویا متاعِ تیموری ۱

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیرِ اولیٰ  
ہو جس کی فقری میں ہوئے اسدِ الہی  
آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی  
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روہا ہی ۲

یا شرعِ مسلمانی، یا دیر کی درباری  
یا نعرۂ مستانہ، کعبہ ہو کہ بت خانہ

میری میں، فقری میں، شاعی میں، غلامی میں  
کچھ کام نہیں بننا، بے جراتِ زندانہ ۳

۱۔ حکیم سنائی سے (ہالِ جبریل..... ۲۶۹)

۲۔ غزل نمبر ۳۴ (ہالِ جبریل..... ۲۸۰)

۳۔ غزل نمبر ۴۷ (ہالِ جبریل..... ۲۸۹)

## فقر

فقر کے ہیں معجزات، تاج و سریہ و سپاہ  
 فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ  
 علم کو مقصود ہے پاکی عقل و خرد  
 فقر کا مقصود ہے، عفتِ قلب و نگاہ  
 علم فقیہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم  
 علم ہے جو یائے راہ، فقر ہے دانائے راہ  
 فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر!  
 فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ  
 علم کا 'موجود' اور، فقر کا 'موجود' اور  
 أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ  
 چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تنگی خودی  
 ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ  
 دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو  
 تیری نگہ توڑ دے، آئینہ مہر و ماہ لے

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے  
 یہ آدم گری ہے، وہ آئینہ سازی ۲

۱۔ غزل نمبر ۵۹ (بال جبریل ..... ۲۹۶)

۲۔ محبت (بال جبریل ..... ۳۵۸)



### فقر

کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو  
آنکھیں میری پینا ہیں، لیکن نہیں بیدار  
آئی یہ صدا سلسلہ فقر ہوا بند  
ہیں اہل نظر کشور پنجاب سے بیزار  
عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطہ کہ جس میں  
پیدا کلمہ فقر سے ہو طرہ و دستار  
باقی کلمہ فقر سے تھا دولہ حق!  
طرزوں نے چڑھایا نعمت خدمت سرکار!

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو چھری  
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری  
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری  
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکیسری  
اک فقر ہے حقیری، اس فقر میں ہے میری  
میراث مسلمان، سرمایہ حقیری

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات  
جو فقر سے ہے میسر، تو نگری سے نہیں

۱۔ پنجاب کے پیر زادوں سے (بال جبریل ..... ۳۶۹)

۲۔ فقر (بال جبریل ..... ۳۷۰)

فقر

اگر جوان ہوں میری قوم کے جسور و غیور  
قلندری مری کچھ کم، سکندری سے نہیں  
سبب کچھ اور ہے، تو جس کو خود سمجھتا ہے  
زوال بندہ مومن کا، بے زری سے نہیں  
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا  
قلندری سے ہوا ہے، تو نگری سے نہیں ۱

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلمان کبھی تو نے  
کیا چیز ہے فولاد کی شمشیر جگر دار  
اس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں  
پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار  
ہے فکر مجھے مصرعِ ثانی کی زیادہ  
اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار  
قبضے میں یہ تلوار بھی آجائے تو مومن  
یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدرؓ کراڑ! ۲

کے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے  
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی

۱۔ مسلمان کا زوال (بال جبریل ..... ۳۹۹)

۲۔ آزادی شمشیر کے اعلان پر (ضربِ کلیم ..... ۴۰۵)



----- فقر -----

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی  
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی ۱۔

کچھ اور چیز ہے شاید تیری مسلمانی  
تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی  
سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار  
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی  
یہ فقر مردِ مسلمان نے کھودیا جب سے  
رہی نہ دولتِ سلمانی و سلیمانی ۲۔

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم  
عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور ۳۔

آدم کا ضمیر اس کی حقیقت پہ ہے شاید  
مشکل نہیں اے سالکِ رہ علمِ فقیری

۱۔ سلطانی (ضربِ کلیم..... ۲۰۹)

۲۔ فقر و راہبی (ضربِ کلیم..... ۲۲۵)

۳۔ غزل (ضربِ کلیم..... ۲۲۶)



— فقر —

فولاد کہاں رہتا ہے ششیر کے لائق  
پیدا ہو اگر اُس کی طبیعت میں حریری  
خود دار نہ ہو فقر تو ہے قبر الٰہی  
ہو صاحبِ غیرت تو ہے تمہیدِ امیری ۱

جو فقر ہوا تلخیِ دوراں کا گلہ مند  
اس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی ۲

غربی میں ہوں محسوسِ امیری  
کہ غیرت مند ہے میری فقیری  
حذر اس فقر و درویشی سے جس نے  
مسلمان کو سکھادی سرِ بیری ۳

۱۔ محرابِ گل افغان کے افکار (ضربِ کلیم..... ۵۲۶)

۲۔ محرابِ گل افغان کے افکار (ضربِ کلیم..... ۵۲۷)

۳۔ رباعی (ارمغانِ جاز..... ۵۵۳)





## باب نمبر ۶

# عشق





خودی اور ایمان و یقین کی پہنچگی اگر منزل ہے، تو اس منزل تک پہنچنے کا واحد مستقیم راستہ عشق ہے۔ قاضی عبدالغفار مرحوم نے کیا خوب لکھا ہے:

”اقبال کے سینے میں دو رُوحوں کا آشیانہ تھا۔ ایک شاعر کی حُسن پرست اور عشق پرور رُوح، اور ایک مسلمان کی ہنگامہ خیز اور شورش انگیز رُوح۔ آخری دور میں حُسن پرست رُوح ساکن اور مسلمان کی رُوح اس طرح ہنگامہ آرا ہو گئی کہ شاعر اپنا پیام بن کر ہر طرف چھا گیا۔ اب سننے والے یہ نہیں دیکھتے کہ زبان اردو ہے یا فارسی۔ اقبال کی شاعری نے زبان اور طرزِ ادا کے امتیازات سے قطع نظر کر لی۔ بس، کہے جاتا ہے، کہے جاتا ہے، جو اُس کو کہنا ہے۔ ”ہر ذر“ نے کہا تھا: ”شاعری نوعِ انسانی کی مادری زبان ہے۔“ اقبال کی شاعری اس قول کی تشریح ہے۔ اُس کے لیے اردو اور فارسی کا امتیاز ایک قصہ پارینہ ہے۔“

یوں تو انہوں نے ابتدائی زمانے میں لفظ ”عشق“ کو اردو اور فارسی کی عام شاعری کے معنوں میں استعمال کیا ہے جو لفظ ”حسن“ کے مقابل آتا ہے۔ اس مفہوم میں انہوں نے کئی نظمیں لکھیں۔ بعض تلف کر دیں۔ بعض نظمیں جو ”ہانگِ در“ میں شامل ہیں، اُن میں ’دُصال، حسن و عشق، سہیلی، محبت، ..... کی گود میں بلی دیکھ کر‘ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بعد کی شاعری میں لفظ عشق ایک اصطلاح بن گیا اور حُسن کی بجائے ”عقل“ کے مقابل آ کر خودی کا حصہ دار بن گیا۔

اس عشق نے اقبال کی شخصیت کو بنایا، پروان چڑھایا اور اُس کی شاعری کویت نئے معانی، افکار کی جولانی اور قوتِ تاثیر عطا کی۔ اپنی شخصیت کو عشق کی سان پر چڑھانے کے لیے اُن کا طریقہ ”آہِ سحر گاہی“ تھا۔ جب سارا عالم خواب غفلت میں پڑا سو تار ہتا، اُسِ اخیر شب میں اقبال کا اٹھنا اور اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا، پھر گڑ گڑانا اور ردنا۔ اقبال علی الصباح اٹھنے کا بہت ہی اہتمام رکھتے تھے۔ سفر و حضر، ہر مقام اور ہر کہیں اُن کے لیے



عشق

سحر خیزی ضروری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جوانوں میں اپنی اس آہ و سوز اور درد و تپش کو دیکھنے کی تمنا کرتے تھے اور دعائیں کرتے کہ خداوند! یہ میرا سوزِ جگر اور میرا عشق آج کل کے مسلم نو جوانوں کو بخش دے۔

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے  
میرا عشق، میری نظر بخش دے

شیشہ دہر میں مانندِ مئے ناب ہے عشق  
روحِ خورشید ہے، خونِ رگِ مہتاب ہے عشق  
دلِ ہر ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی  
نور یہ وہ ہے کہ ہر شے میں جھلک ہے اس کی  
کہیں سامانِ مسرت، کہیں سازِ غم ہے  
کہیں گوہر ہے کہیں اشک، کہیں شبنم ہے!

ہے ابد کے نسیمِ دیرینہ کی تمہید عشق  
عقلِ انسانی ہے فانی، زندہ جاوید عشق  
عشق کے خورشید سے شامِ اجل شرمندہ ہے  
عشق سوزِ زندگی ہے تا ابد پائندہ ہے  
عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مرجاتا نہیں  
روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں



عشق

ہے بقائے عشق سے پیدا بقا محبوب کی  
زندگانی ہے عدم نا آشنا محبوب کی ۱

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل  
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی  
بے خطر کود پڑا آتشِ نرود میں عشق  
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی  
عشق فرمودہ قاصد سے سبک گامِ عمل  
عقل سمجھی ہی نہیں معنی پیغام ابھی ۲

گرچہ تو زندانی اسباب ہے  
قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ  
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں  
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ ۳

۱۔ فلسفہ عجم (ہانگ درا..... ۱۲۲)

۲۔ غزل (بال جبریل ..... ۲۲۰)

۳۔ غزل (بال جبریل ..... ۲۲۳)

— عشق —

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام  
اس زمیں و آسمان کو بے کراں سمجھا تھا میں !

عشق ہے پیدا نوائے زندگی میں زیرو بزم  
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوئے دم بدم  
آدی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق  
شاخ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم ہے

اگر ہو عشق، تو ہے کفر بھی مسلمانی  
نہ ہو، تو مردِ مسلمان بھی کافر و زندیق ہے

عشق بیاں سے ہاتھ اٹھا، اپنی خودی میں ذوب جا  
نقش و نگارِ دیر میں خونِ جگر نہ کر تلف  
کھول کے کیا بیاں کروں سرِ مقامِ مرگ و عشق  
عشق ہے مرگِ با شرف، مرگِ حیاتِ بے شرف ہے

۱۔ غزل نمبر ۱۴ (بالِ جبریل ..... ۲۳۹)

۲۔ غزل نمبر ۹ (بالِ جبریل ..... ۲۶۱)

۳۔ غزل نمبر ۱۱ (بالِ جبریل ..... ۲۶۳)

۴۔ غزل نمبر ۱۶ (بالِ جبریل ..... ۲۶۷)



عشق

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ  
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ  
نہ بادہ ہے، نہ صراحی، نہ دورِ پیمانہ  
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ  
مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبال  
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ ۱

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی  
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی  
عطار ہو، روی ہو، ہو رازی ہو، غزالی ہو  
کچھ ہاتھ نہیں آتا، بے آہِ سحر گاہی ۲

عشق تری، انتہا، عشق مری انتہا  
تو بھی ابھی نا تمام، میں بھی ابھی نا تمام  
آہ! کہ کھویا گیا تجھ سے فقیری کا راز  
ورنہ ہے مالِ فقیر، سلطنتِ روم و شام ۳

۱۔ غزل نمبر ۲۸ (بالِ جبریل ..... ۲۷۵)

۲۔ غزل ۳۲ (بالِ جبریل ..... ۲۷۹)

۳۔ غزل نمبر ۴۱ (بالِ جبریل ..... ۲۸۴)



عشق

جمالِ عشق و مستی نے نوازی  
جلالِ عشق و مستی بے نیازی  
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدر  
زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی ۱

کبھی تنہائی کوہ و دمنِ عشق  
کبھی سوز و سرور و انجمنِ عشق  
کبھی سرمایہ محراب و منبر  
کبھی مولا علیٰ خیرِ شمعِ عشق ۲

کبھی آوارہ و بے خانماں عشق  
کبھی شاہِ شہاں نوشیرواں عشق  
کبھی میداں میں آتا ہے زرہ پوش  
کبھی عریان و بے تنگ و سناں عشق ۳

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام  
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

۱۔ رباعی (بال جبریل ..... ۳۰۲)

۲۔ رباعی (بال جبریل ..... ۳۰۴)

۳۔ رباعی (بال جبریل ..... ۳۰۴)



## عشق

مردِ خدا کا عمل، عشق سے صاحبِ فروغ  
 عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام  
 تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو  
 عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام  
 عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا  
 اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام  
 عشق دمِ جبریل، عشق دلِ مصطفیٰ  
 عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام  
 عشق کی مستی سے ہے، میکرِ گل تابِ ناک  
 عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاسِ الکرام  
 عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جنود  
 عشق ہے ابنِ السبیل، اس کے ہزاروں مقام  
 عشق کے مضراب سے نغمہٗ تارِ حیات  
 عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات ۱

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی  
 نقشِ گرِ ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی

### عشق

دانش و دین و علم و فن، بندگی ہوں تمام  
عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی  
جوہر زندگی ہے عشق، جوہر عشق ہے خودی  
آہ کہ ہے یہ تیغ تیز، پردگی نیام ابھی ۱

عقل و دل و نگاہ کا مرشد ادلیں ہے عشق  
عشق نہ ہو تو شرع و دیں، بت کدہ تصورات  
صدقہ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبر حسینؑ بھی ہے عشق  
معرکہ وجود میں بدر و جنین بھی ہے عشق ۲

تازہ مرے ضمیر میں معرکہ کہن ہوا  
عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام بولہب  
گاہ بخیلہ می برد، گاہ بزور می کشد  
عشق کی ابتدا عجب، عشق کی انتہا عجب ۳

۱۔ فرشتوں کا گیت (بال جبریل..... ۳۲۳)

۲۔ ذوق و شوق (بال جبریل..... ۳۲۶)

۳۔ ذوق و شوق (بال جبریل..... ۳۲۹)



— عشق —

علم نے مجھ سے کہا، عشق ہے دیوانہ پن  
 عشق نے مجھ سے کہا، علم ہے تخمین و ظن  
 بندہ تخمین و ظن، کرم کتابی نہ بن  
 عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب  
 عشق کی گرمی سے ہے معرکہ کائنات  
 علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات  
 عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات  
 علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب  
 عشق کے ہیں معجزات، سلطنت و فقر و دیں  
 عشق کے ادنیٰ غلام، صاحب تاج و تکیں  
 عشق مکان و مکین، عشق زمان و زمین  
 عشق سراپا یقین، اور یقین فتح یاب  
 شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام  
 شورش طوفان حلال، لذت سائل حرام  
 عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام  
 علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے اُم الکتاب ۱







باب نمبر ۷

# عشقِ قرآن

www.KitaboSunnat.com





## ----- عشقِ قرآن -----

اقبال کی زندگی پر کلامِ الہی جس قدر اثر انداز ہوا ہے، اُتنا وہ کسی شخصیت سے متاثر ہوئے ہیں اور نہ کسی کتاب نے اُن پر ایسا اثر ڈالا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ ”اقبال کا ایمان چونکہ ”نومسلم“ کا سا ہے، خاندانی وراثت کے طور پر نہیں ملا ہے، اس لیے اُن کے اندر نسلی مسلمانوں کے مقابلے میں قرآن سے شغف، تعلق اور شعور و احساس کے ساتھ مطالعے اور تلاوت کا ذوق بہت زیادہ ہے۔“

قرآن کا پڑھنا عام کتابوں کے پڑھنے سے بہت ہی مختلف رہا ہے، جیسا کہ خود اقبال نے اپنے قرآن مجید پڑھنے کے سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ اُن کا یہ ہمیشہ کا دستور تھا کہ روزانہ بعد نماز فجر قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اقبال کے والد جب اُنہیں دیکھتے تو فرماتے، کیا کر رہے ہو؟ اقبال جواب دیتے ”قرآن پڑھ رہا ہوں۔“ کچھ دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر ایک دن اقبال نے پوچھا: ”ابا جان، آپ مجھ سے روزانہ پوچھتے ہیں، اور میں ایک ہی جواب دیتا ہوں اور پھر آپ خاموش چلے جاتے ہیں۔“ تو انہوں نے جواب دیا ”میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم قرآن اس طرح پڑھا کرو کہ جیسے قرآن اسی وقت تم پر نازل ہو رہا ہے۔“ اس کے بعد سے اقبال نے قرآن برابر سمجھ کر پڑھنا شروع کیا اور اس طرح کہ گویا وہ واقعی اُن پر نازل ہو رہا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی پوری زندگی قرآن مجید میں غور و فکر اور تدبر و فکر کرتے گزاری، قرآن مجید پڑھتے، قرآن سوچتے، قرآن بولتے۔ نوجوانانِ ملت کے لیے وہ ایک پیغام چھوڑ گئے ہیں: ”میں اس گھر کو صد ہزار تحسین کے قابل سمجھتا ہوں، جس گھر میں علی الصبح تلاوتِ قرآن مجید کی آواز آئے۔“ یعنی تلاوت ہو اور آواز کے ساتھ ہو۔

زمیں کیا آسمان بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے  
غضب ہے سطرِ قرآن کو چلیپا کر دیا تو نے





عشق قرآن

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل!  
بنایا ہے بت پندار کو اپنا خدا تو نے لے

صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے  
نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے  
تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے  
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے  
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں  
ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں!؎

صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟  
نوع انساں کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟  
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟  
میرے قرآن کو سینوں سے لگایا کس نے؟  
تھے تو آبا وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو  
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہوا؎

ہر کوئی مست ہے ذوقِ تن آسانی ہے  
تم مسلمان ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟

۱۔ تصویر درد (ہانگ درا..... ۵۳) ۲۔ شکوہ (ہانگ درا..... ۱۲۹)

۳۔ جواب شکوہ (ہانگ درا..... ۱۵۷)



عشق قرآن

حیدرؓ فقر ہے، نے دولت عثمانیٰ ہے  
تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟  
وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر  
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر!

اے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر  
مجھے معلوم کیا، وہ راز داں تیرا ہے یا میرا؟  
محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا  
مگر یہ حرفِ شیریں، ترجماں تیرا ہے یا میرا؟

حاضر ہیں کلیسا میں کباب و نئے گلگوں  
مسجد میں دھرا کیا ہے بجز موعظہ و پند  
احکام ترے حق ہیں، مگر اپنے مفسر  
تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پازند

وہ دانائے سُبُل، ختمِ الرسل، مولائے کلؑ جس نے  
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادی سینا

۱۔ جواب شکوہ (بانگ درا..... ۱۵۹)

۲۔ غزل نمبر ۲ (بال جبریل..... ۲۴۰)

۳۔ غزل نمبر ۱۶ (بال جبریل..... ۲۵۱)

عشق قرآن

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل ، وہی آخر  
وہی قرآن ، وہی فرقاں ، وہی لیسیں ، وہی طاہرانہ

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم  
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر  
'تن بہ تقدیر' ہے آج ان کے عمل کا انداز  
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر  
تھا جو 'ناخوب، بتدرج' وہی 'خوب' ہوا  
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیرؔ

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے  
نہ کہیں لذتِ کردار، نہ افکارِ عمیق  
حلقہٴ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں  
آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق!  
خود بدلنے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں  
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!  
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب  
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق!ؔ

۱۔ غزل نمبر ۱ (حصہ دوم، بال جبریل..... ۲۵۶) ۲۔ تن بہ تقدیر (ضرب کلیم..... ۳۹۶)

۳۔ اجتہاد (ضرب کلیم..... ۲۰۱)



عشق قرآن

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن  
قاری نظر آتا ہے ، حقیقت میں ہے قرآن بل

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلمان  
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

جانتا ہوں میں یہ امت حامل قرآن نہیں  
ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دیں

۱۔ مرد مسلمان (ضرب کلیم.....۴۳۳)

۲۔ اشتراکیت (ضرب کلیم.....۴۹۵)

۳۔ ابلیس اپنے مشیروں سے (ارمغان حجاز.....۵۳۹)





باب نمبر ۸

# عشق رسولؐ



عشق اقبال کی باطنی زندگی میں ارتقا پا کر عشق رسولؐ بن گیا ہے۔ جب وہ رسول کریمؐ کا تذکرہ کرتے ہیں تو اُن کا شعری وجدان جوش مارنے لگتا ہے اور اشعار خود بہ خود نعت کی صورت اختیار کرنے لگتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے محبت و عقیدت کے پیشے پھوٹ پڑے ہیں۔

در دل مُسلم مقامِ مصطفیٰؐ است  
آبروئے مازِ نامِ مصطفیٰؐ است  
شورِ عشقش در نئے خاموشِ من  
می تپد صد نغمہ در آغوشِ من

جوں جوں زندگی کے دن گزرتے گئے آنحضورؐ کے ساتھ اقبال کا عشق جنون کی صورت اختیار کرتا گیا، یہاں تک کہ آخری عمر میں جب بھی اُن کی مجلس میں نبی کریمؐ کا ذکر آتا یا مدینہ منورہ کا ذکر ہوتا تو اقبال بے قرار ہو جاتے، آنکھیں بھرا آتیں، یہاں تک کہ آنسو رواں ہو جاتے، بعض اوقات ہچکیاں بندھ جاتیں۔ مدینہ کا نام آتے ہی پیاناہ عشق لبریز ہو جاتا اور اشکِ محبت کی جھڑیاں لگ جاتیں۔ وہ حج یا عمرے کے لیے بڑے بے تاب رہتے لیکن انہیں یہ سعادت جسما نہ نصیب نہ ہو سکی، لیکن انہوں نے ”ارمغانِ حجاز“ کے ایک باب پر عنوان ”بہ حضور رسالت“ میں آنحضورؐ کو مخاطب کر کے اپنے ذاتی وارداتِ قلب اور اُمّتِ مسلمہ کی دل گداز تصویر کھینچ کر رکھ دی۔

اقبال کے اکثر و بیش تر اشعار میں عشق رسولؐ کی تب و تاب نمایاں ہے۔ یہاں چند اردو اشعار کے انتخاب کے علاوہ ”ارمغانِ حجاز“ کے اُس حصے کا انتخاب (مع ترجمہ) شامل ہے، جس میں اقبال ”بہ حضور رسالت“ روحانی طور پر پیش ہوتے ہیں۔



----- عشق رسول -----

سالارِ کارواں ہے میرِ حجازِ اپنا  
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے  
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں  
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس  
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

اے بادِ صبا! کھلی والے سے جا کہو پیغام مرا  
قبضے سے امتِ بیچاری کے دیں بھی گیا، دنیا بھی گئی

۱۔ ترانہٴ ملی (ہائیکو در..... ۱۲۴)

۲۔ جوابِ شکوہ (ہائیکو در..... ۱۶۱)

۳۔ جوابِ شکوہ (ہائیکو در..... ۱۶۲)

۴۔ صدیقؐ (ہائیکو در..... ۱۷۴)

۵۔ غزل (ہائیکو در..... ۲۲۹)



عشق رسول

اے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر  
مجھے معلوم کیا! وہ راز داں تیرا ہے یا میرا؟  
محمدؐ بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا  
مگر یہ حرفِ شیریں تر جہاں تیرا ہے یا میرا؟!

وہ دانائے سُبُل، ختمِ الزل، مولائے کلؑ جس نے  
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادی سینا  
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل، وہی آخر  
وہی قرآن، وہی فرقاں، وہی یسین، وہی طاہرؑ

تو اے مولائے یثربؑ! آپ میری چارہ سازی کر  
مری دانش ہے افرنگی، مرا ایمان ہے زتاریؑ

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا اتر  
اب تو ہی بتا، تیرا مسلمان کدھر جائے!  
وہ لذتِ آشوب نہیں بحرِ عرب میں  
پوشیدہ جو ہے مجھ میں، وہ طوفانِ کدھر جائے  
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ  
آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے!

- ۱۔ غزل نمبر ۲ (بال جبریل..... ۲۴۰) ۲۔ نادر شاہ غازی (بال جبریل..... ۲۵۶)  
۳۔ غزل نمبر ۱۴ (بال جبریل..... ۲۶۵) ۴۔ اے روحِ محمدؐ (ضربِ کلیم..... ۲۲۳)

### عشق رسول

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا  
روح محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو  
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات  
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو ۱

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است  
چہ بے خبر ز مقامِ محمدؐ عربی است  
بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست  
اگر بہ او نرسیدی، تمام بولہبی است ۲

### حضور رسالتؐ

آگے جو اشعار پیش کیے جا رہے ہیں، علامہ اقبال کی لازوال تخلیق ”ارمغان حجاز“ کے اُس باب سے ماخوذ ہیں، جس کا عنوان ہے ”حضور رسالتؐ“۔ اس باب کا آغاز وہ فارسی شاعر عزت بخاری کے اس مشہور شعر سے کرتے ہیں۔

ادب گاپست زیرِ آسماں از عرشِ نازک تر  
نفسِ گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

ترجمہ: رسول کریمؐ کا شہر مدینہ یا روضہ مبارک ایک ایسی ادب گاہ ہے، جہاں حضرت جنید بغدادی اور حضرت بایزید بسطامی جیسے عظیم اولیا بھی سانسِ گم کیے ہوئے آتے ہیں کہ کہیں سانس لینا بھی بے ادبی میں شامل نہ ہو جائے۔

۱۔ ابلیس کا فرمان (ضربِ کلیم..... ۵۰۳)

۲۔ حسین احمد (ارمغان حجاز..... ۵۱۸)



## عشق رسول

شہر نبوی کو عزت بخاری کی زبان میں نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے بعد اقبال عالم خیال میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا سفر شروع کرتے ہیں، اور اس تھوڑے سا تھوڑے قافلہ شوق کے ہمراہ نرم ریگستانی زمین پر رواں دواں ہیں۔ ذوق حضوری اور شوق و محبت میں یہ ریت اُن کو ریشم سے بھی زیادہ نرم محسوس ہو رہی ہے، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا ہر ذرہ دل بن کر دھڑک رہا ہے۔ اقبال ساربان سے کہتے ہیں کہ ان دھڑکتے ہوئے دلوں کا خیال کرے اور نرم روی اختیار کرے۔

چہ خوش صحرا کہ شامش صبح خند است  
شبش کوتاہ و روز او بلند است  
قدم اے راہرو آہستہ تر نہ  
چو ما ہر ذرہ او درد مند است

ترجمہ: مدینے کے راستے کا صحرا کتنا اچھا ہے کہ اس کی شام صبح کی مانند مسکراتی ہوئی ہے، جس میں ہر طرف پھول کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں کی رات لمبی اور دن چھوٹا ہے۔ اے راہی! اس صحرا کی ریت پر بڑی نرمی سے قدم رکھ، کیوں کہ اس کا ہر ذرہ میری طرح درد مند ہے۔

پھر اقبال اسی عالم خیال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر حاضر ہوتے ہیں۔ درود و سلام پڑھتے ہیں۔ محبت و شوق کی زبان ان کے دل کی ترجمان بن جاتی ہے اور وہ اس مبارک وقت اور سنہری موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنا حالی دل بیان کرتے ہیں۔ امت اور عالم اسلام کی حالت زار، ان کے مسائل اور مشکلات، آزمائش اور امتحانات، نیز مغربی تہذیب و تعلیم اور مادی فلسفوں اور تحریکوں کے سامنے مسلمانوں کی بے بسی، اپنے اپنے وطن میں ان کی غریب الوطنی اور خود اپنے مسلمانان ہند میں اپنے پیغام کی ناقدری کا شکوہ کرتے ہیں۔ کبھی ان کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں اور کبھی دل کی بات زبان پر آ جاتی ہے۔



— عشق رسول —

اقبال کا یہ روحانی سفر اس زمانے میں ہوا، جب ان کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ حج اور زیارتِ مقدسہ کی حسرت و تمنا ان کے دل میں جاگزیں تھی، لیکن ذوقِ سفر سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ جسمانی طور پر در رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پیادہ گئے ہیں۔

بایں پیری رہ یثرب گرفتہ  
نواخواں از سرور عاشقانہ  
چو آں مرغ کہ در صحرا سرشام  
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

ترجمہ: میں نے اس بڑھاپے میں یثرب کی راہ اختیار کی ہے۔ عاشقانہ نواخوانی کی مستی اور سرور میں چلا جا رہا ہوں اس پرندے کی طرح جو صحرا میں شام کے وقت اپنے گھونسلے کی فکر میں پرکھوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ اس وقت جبکہ میری زندگی کا آفتاب لبِ بام ہے، اگر میں نے مدینہ منورہ کا قصد کیا تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ جس طرح شام کے وقت پرندے اپنے اپنے آشیانے (حقیقی مسکن) کی طرف جاتے ہیں، اسی طرح میری روح بھی اب اپنے حقیقی آشیانے کی طرف واپس جانا چاہتی ہے۔

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان جب اقبال کی اونٹنی اپنی رفتار تیز کر دیتی ہے تو وہ اس سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ سوار بہت خستہ و بیمار ہے، لیکن اونٹنی ان کا مشورہ نہیں مانتی۔ وہ مستانہ وار قدم تیز تر کرتی جاتی ہے، گویا یہ صحرا نہیں، بلکہ ریشم کا نرم فرش بچھا ہوا ہے۔

سحر با ناقہ گفتم نرم تر رو  
کہ راکب خستہ و بیمار و پیر است



— عشق رسول —

قدم مستانہ زد چندان کہ گوئی  
پاپیش ریگ ایں صحرا حریر است  
ترجمہ: صبح کے وقت میں نے اونٹنی سے کہا کہ ذرا نرمی اور آہستگی سے چل۔ تجھ پر جو  
شخص سوار ہے، وہ کم زور، بیمار اور بوڑھا ہے۔ میں نے جتنا زیادہ اصرار کیا، اس نے اتنا ہی  
قدم تیز تر کر دیے۔ کیوں کہ وہ بھی جلوہ رسول کا شوق رکھتی تھی۔ جب وہ چلتی تھی تو ایسا  
معلوم ہوتا تھا کہ وہ صحرا کی ریت پر نہیں چل رہی، بلکہ ریشمی کپڑے پر چل رہی ہے۔  
اب یہ کاروانِ مدینہ درود و سلام کی سوغات لیے اپنی منزل کی طرف رواں دواں  
ہے۔ اس پر کیف فضا میں اقبال تمنا کرتے ہیں کہ کاش ان کو اس گرم ریت پر ایک ایسا سجدہ  
میسر ہو جو ان کی پیشانی کے لیے نقشِ دوام بن جائے۔ وہ اہل قافلہ کو بھی اسی سجدہ شوق کا  
مشورہ دیتے ہیں۔

چہ خوش صحرا کہ دروے کارواں ہا  
دروے خواند و محمل براند  
بہ ریگ گرم او آور سجودے  
جبین را سوز تا داغے بماند

ترجمہ: کتنا اچھا ہے یہ صحرا، جس میں قافلے والے درود پڑھتے جاتے ہیں اور محمل  
والے اونٹوں کو ہانکتے جاتے ہیں۔ اس صحرا کی گرم ریت پر سجدے کر۔ پیشانی کو اس کے  
سوز سے جلا، تاکہ اس پر ایک داغ ہمیشہ کے لیے رہ جائے۔  
ذوق و شوق کا زیادہ غلبہ ہوتا ہے تو عراقی اور جامی کے اشعار بے ساختہ ان کی  
زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔

گہے شعر عراقی را بخوانم  
گہے جامی زند آتش بجانم



— عشق رسول —

ندائم گرچہ آہنگِ عرب را  
شریکِ نغمہ ہائے سارِ بانم

ترجمہ: کبھی میں فخر الدین عراقی کے شعر پڑھنے لگتا ہوں اور کبھی مولانا عبدالرحمن جامی کے شعر میری جان میں آگ لگاتے ہیں۔ اگرچہ عربوں کا آہنگ نہیں جانتا، لیکن میں ساربان کے نغمے میں، آواز سے آواز ملا کر شریک ہوں۔

لوگ حیرت سے دیکھنے لگتے ہیں کہ یہ عجیب آخر کس زبان میں اشعار پڑھ رہا ہے جو سمجھ میں نہیں آتے لیکن دل کو درد و محبت سے اس طرح بھر دیتے ہیں کہ آدمی کو کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہتا اور پانی کے بغیر بھی اس کی تشنگی دور ہو جاتی ہے۔

امیرِ کارواں ! آں اعمی کیست؟  
سرودِ او بآہنگِ عرب نیست  
زند آں نغمہ کز سیرابیِ او  
خُشک دل در بیابانے توای زیست

ترجمہ: اے امیرِ کارواں! یہ تیرے قافلے میں کون اعمی ہے، جس کا سرود، جس کی لے عرب کے آہنگ سے جدا ہے۔ یہ ایسا نغمہ الاپ رہا ہے جس سے اس کا دل اس بیابان میں گرمی کے باوجود سیرابی اور ٹھنڈک محسوس کر رہا ہے۔

راستے کی دشواریوں اور مشقتوں میں ان کو لطف آنے لگتا ہے۔ شب بیداری، کم خوابی اور بے آرامی سے سرور حاصل ہوتا ہے۔ وہ اس راستے کو طویل نہیں سمجھتے اور جلد پہنچنے کی آرزو نہیں کرتے، بلکہ اپنے ساربان سے اس کی خواہش کرتے ہیں کہ وہ اس سے بھی زیادہ طویل اور دراز تر راستے سے لے چلے، تاکہ اس بہانے سے ذوق و شوق کی مدت بھی کچھ دراز ہو سکے اور انتظار کا لطف دو بالا ہو سکے۔

غمِ راہی نشاطِ آمیز تر کن  
فغانِ راجنوں انگیز تر کن



— عشق رسول —

بگیر اے سارباں راہِ درازے  
مرا سوزِ جدائی تیز تر کن

ترجمہ: اے سارباں! مجھ راہی کے غم کو زیادہ نشاط آمیز اور لذت خیز بنا۔ میری آہ و  
نغاں میں زیادہ جنون پیدا کر۔ اے سارباں! کوئی لمبا راستہ اختیار کر۔ میرے سوزِ جدائی  
اور تیز کر۔

اسی سرور و شوق اور کیف و مستی کے ساتھ وہ سارا راستہ طے کرتے ہوئے مدینہ  
منورہ پہنچتے ہیں اور اپنے رفیق سفر سے کہتے ہیں کہ ہم دونوں ایک ہی زلف کے اسیر ہیں۔  
آج ہم کو اپنے دل کی مراد بر لانے اور اپنے آقا اور محبوب کے قدموں پر اپنی پلکیں بچھانے  
کا موقع ملا ہے، اس لیے آج ہمیں اپنی آنکھوں پر سے پابندی ہٹالینی چاہیے، اور اس  
سیلابِ اشک کو جو عرصے سے امنڈنے کے لیے بے چین ہے، تھوڑی دیر کے لیے آزاد  
چھوڑ دینا چاہیے۔

بیا اے ہم نفس باہم نالیم  
من و تو کشتہ شانِ ہمالیم  
دو حرفے بر مرادِ دل بگویم  
پائے خواجہ چشماں را بہالیم

ترجمہ: آ، اے میرے ہم نفس، ہم مل کر روئیں، کیوں کہ میں اور تو، ہم دونوں اس  
کی شانِ جمال، جلوۂ محبوب کے مارے ہوئے ہیں۔ ہم دونوں اپنے دل کی مراد کے بارے  
میں کچھ کہیں، اور روضہ رسولؐ پر جا کر اپنے خواجہ کے پاؤں پر اپنی آنکھیں ملیں۔  
اقبال اپنے اوپر رشک کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کیسی خوش نصیبی اور کیسا مقام  
مسرت ہے کہ یہ سعادت اور نعمت ان کے نصیب میں آئی اور اس درویش کو نااہلی کے  
باوجود اس دربارِ شاہی میں نوازا گیا، جہاں بڑے بڑے دانش وروں اور رنگ نشینوں کو





— عشق رسول —

باریابی کی توفیق حاصل نہ ہو سکی۔

حکیموں را بہا کمتر نہادند  
بنا داں جلوۂ مستانہ دادند  
چہ خوش بختے چہ خرم روزگارے  
در سلطان بہ درویشے کشادند

ترجمہ: یہاں (مدینہ منورہ میں) اہل عقل و حکمت کی بہت کم قیمت پڑی ہے۔  
یہاں تو ان نادانوں کو جلوۂ مستانہ سے نوازا جاتا ہے جو عشقِ رسولؐ میں گم ہیں۔ میں کینا  
خوش نصیب ہوں اور میری زندگی کیسی خوش و خرم ہے کہ مجھ جیسے درویش پر سلطان کے  
دروازے کھول دیے گئے۔

لیکن اس خوش نصیبی، سرور و مستی اور جذب و شوق میں بھی وہ امیہؓ مسلمہ اور عالم  
اسلام کو فراموش نہیں کرتے اور پوری صدق دلی، صدق بیانی اور قادر الکلامی کے ساتھ ان  
کی حالتِ زار اور دردِ دل، کتاب کی طرح کھول کر سامنے رکھ دیتے ہیں۔

مسلمان آں فقیری کج کلا ہے  
رمید از سینہ او سوزِ آہ ہے  
دلش نالد، چرانالد؟ نداند  
نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

ترجمہ: مسلمان جس کی شان یہ ہے کہ وہ فقیری میں بھی بادشاہ ہوتا ہے، بے  
سروسامانی میں بھی سوائے باری تعالیٰ کے ہر ایک سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ آج اپنی مسلمانی  
شان کھو چکا ہے۔ اس کے سینے میں اسلام کی حرارت ختم ہو چکی ہے۔ آج اس کا دل رد رہا  
ہے۔ کیوں رد رہا ہے؟ یہ اسے معلوم نہیں۔ یا رسول اللہ ایک نگاہِ کرم، کہ اس کی تقدیر بدل  
جائے۔



— عشق رسول —

تب و تاب دل از سوزِ غم تست  
نوائے من ز تاثیر دم تست  
بنالم زانکہ اندر کشورِ ہند  
ندیدم بندہ کو محرم تست

ترجمہ: میرے دل کی تب و تاب یا رسول اللہ، تیرے سوزِ عشق کی وجہ سے ہے۔  
میری شاعری میں اگر کوئی تاثیر ہے تو وہ تیرے دم سے ہے۔ میں روتا اس لیے ہوں کہ  
ہندوستان میں میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو تیرا محرم ہو، تجھے جاننے اور پہچاننے والا  
ہوں۔

شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست  
بایں خاکِ آفتابے را گزر نیست  
بما کن گوشہ چشمتے کہ در شرق  
مسلمانے زما بیچارہ تر نیست

ترجمہ: ہندوستان کے غلاموں کی شب کی سحر نہیں ہے۔ اس مٹی میں سورج کا گزر  
نہیں۔ ہماری طرف نگاہِ کرم کر، کیوں کہ مشرق میں، ہندوستان کے غلام مسلمانوں سے  
زیادہ کوئی مسلمان بے چارہ، بے کس اور تنہا نہیں۔

چہ گویم زان فقیرے درد مندے  
مسلمانے بہ گوہر ارجمندے  
خدا ایں سخت جاں را یارِ بادا  
کہ افتاد است از بامِ بلندے

ترجمہ: میں اس درد مند فقیر (مسلمان) کے بارے میں کیا عرض کروں۔ کبھی یہ قیمتی  
گوہر ارجمند تھا۔ خدا اس سخت جان کا یار و مددگار ہو، یہ بہت اونچی چھت سے گرا ہے۔



عشق رسول

اس امت کی بڑی آزمائش یہ ہے کہ یہ بامِ بلند سے گری ہے اور جو جتنا اوپر سے گرتا ہے، اتنی ہی زیادہ سخت چوٹ اسے آتی ہے۔

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ اس امت کی پریشانی، بد حالی اور بے نظمی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جماعت ہے اور امام نہیں۔ افراد ہیں مگر نظام نہیں۔

ہنوز ایں چرخ نیلی کج خرام است

ہنوز ایں کارواں، دور از مقام است

زکارِ بے نظام اُو چہ گویم

توی دانی کہ ملت بے امام است

ترجمہ: مسلمانوں کے لیے یہ نیلا آسمان ابھی تک ٹیڑھی چال چل رہا ہے۔ مسلمانوں کا قافلہ ابھی تک اپنی منزل سے دور ہے۔ ان کی بے نظمی کے متعلق کیا عرض کروں۔ تو جانتا ہے کہ یہ ملت بے امام ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اس کے خون میں اب وہ تب و تاب اور اس کے اندر مردم خیزی کی وہ صلاحیت باقی نہیں رہی، جو اس کا طرہ امتیاز تھا۔ اب عرصے سے اس کی نیام بے شمیر اور اس کی ”کشت ویراں“ لالہ و گل سے محروم ہے۔

نماند آں تاب و تب در خون تابش

نروید لالہ از کشتِ خرابش

نیام اُو تہی چوں کیسہ او

بطاق خانہ ویراں کتابش

ترجمہ: آج کے مسلمان میں وہ پہلی سی تب و تاب نہیں رہی۔ یہ سب ہے کہ اس کے ویران کھیت میں لالہ و گل نہیں اگتے۔ اس کی نیام اس کی جیب کی طرح خالی ہے۔ اس نے اپنی کتاب (قرآن) کسی ویران گھر کے طاق میں رکھ دی ہے۔



— عشق رسول —

وہ کہتے ہیں کہ یہ امت اپنے سرمایہ آرزو اور ذوق جستجو سے محروم ہو کر رنگ و بو میں گرفتار ہو گئی ہے۔ اس کے کان نرم و نازک نغموں کے خوگر ہو گئے ہیں اور مردانِ حرکی آواز اس کے لیے نامانوس ہو چکی ہے۔

دلِ خود را اسیرِ رنگ و بو کرد  
تہی از ذوق و شوق و آرزو کرد  
صغیرِ شاہبازاں کم شناسد  
کہ گوشش باطنینِ پشہ خو کرد

ترجمہ: آج کے مسلمان نے اپنے دل کو رنگ و بو کا اسیر کر لیا ہے۔ خود کو ذوق و شوق اور آرزو سے خالی کر لیا ہے۔ وہ شاہبازوں کی آواز نہیں پہچانتا، کیونکہ اس نے اپنے کانوں کو چھری بھنھناٹ سننے کا عادی بنا لیا ہے۔

اب نہ اس کی آنکھ میں یقین کا نور اور عشق کا سرور ہے، نہ اس کا دل کسی کی محبت میں محمور، نہ اس کا سینہ کسی کی یاد سے معمور ہے۔ وہ حضوری سے بہت دور اور منزلِ مقصود سے نا آشنا اور بھور ہے۔

پیشم او نہ نور و نے سرور است  
نہ دلِ در سینہ او ناصبور است  
خدا آن امتے را یارِ بادا  
کہ مرگِ او ز جانِ بے حضور است

ترجمہ: اس کی آنکھ میں نہ نور ہے اور نہ سرور ہے۔ نہ اس کا سینہ میں ناصبور (بے قرار) دل ہے۔ اس امت کا خدا ہی یارِ مددگار ہے کہ جس کی موت بے حضور جان سے ہے، یعنی اس کی زندگی ایسی ہے جس میں اس کا خدا پر یقین نہیں ہے۔

پھر اقبال اس کے شانِ دار ماضی کا موازنہ اس کے داغِ دار حال سے کرتے ہیں۔



— عشق رسول —

وہ بڑی بلاغت اور خوش اسلوبی کے ساتھ کہتے ہیں کہ جس کو آپ نے بڑے لاڈ پیار سے پالا تھا اور ناز و نعم میں رکھا تھا، وہ آج ان صحراؤں میں اپنا رزق تلاش کرنے اور در بہ در بھٹکنے پر مجبور ہے۔

مُہرَس از من کہ احوالِ چناں است  
زمینش بد گہر چوں آسماں است  
برآں مرغی کہ پروردی بانجیر  
تلاش دانہ در صحرا گراں است

ترجمہ: مجھ سے مت پوچھیے کہ مسلمان کا کیا احوال ہے۔ اس کی زمین بھی آسمان کی طرح بد گہر اور بد حال ہے، یعنی آسمان بھی اس کا موافق نہیں اور زمین بھی۔ اس پرندے پر، جس کی پرورش آپ نے انجیریں کھلا کر کی ہے، صحرا میں دانہ تلاش کرنا بھاری ہو گیا ہے۔  
پھر اقبال رسول کریمؐ کے حضور لادینیت کے اس طوفانِ بلاخیز کا ذکر کرتے ہیں، جو عالم اسلام کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اقبال اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اسلامی ممالک میں لادینیت کا سب سے بڑا راستہ خالص مادہ پرستانہ نقطہ نظر، روحانی خلا اور قلب کی برودت ہے۔ مسرفانہ زندگی سے اس میں اور مدد مل رہی ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ لادینیت کے اس سیلاب اور مادہ پرستانہ معاشی فلسفے کا مقابلہ اگر کسی چیز سے ہو سکتا ہے تو وہ زہد و محبت ہے۔ اس پر اگر کوئی چیز غالب آسکتی ہے تو وہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی زاہدانہ اور عاشقانہ زندگی ہے۔ وہ مسلمانوں کے لیے اس مثالی زندگی کی آرزو کرتے ہیں، جو زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایسی زندگی وجود میں آجائے تو ساری دنیا اس کے سامنے سر جھکانے اور اس کا احترام کرنے پر مجبور ہوگی۔

دگرگوں کرد لادینی جہاں را  
ز آثار بدن گفتند جہاں را



— عشق رسول —

ازاں فقرے کہ با صدیق دادی

بشورے آور ایں آسودہ جاں را

ترجمہ: عصر حاضر میں لادینیت نے جہان کو تہ و بالا کر دیا۔ مادیت اس حد تک پھیل چکی ہے کہ آج روح کو بھی جسم کے نشانات میں سے یعنی جسم کی طرح مادی کہا جا رہا ہے۔ اس فقیری سے جو آپؐ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کو عطا کی تھی، مسلمانوں کی آسودہ اور آرام پسند زندگی میں ایک ولولہ اور شور پیدا کریں۔

اقبال مسلمانوں کے زوال کا سبب غربت و افلاس اور مادی وسائل کی کمی کو نہیں سمجھتے، بلکہ اس کی توجیہ اس ”شعلہ زندگی“ کی افسردگی سے کرتے ہیں جو کسی زمانے میں ان کے سینے کے اندر فروزاں تھا۔

جب یہ درویش اور فقیر ایک اللہ کے لیے سجدہ ریز تھے اور کسی اور کا اقتدار اور اختیار تسلیم نہیں کرتے تھے، اس وقت شہنشاہوں کا گریبان ان کے ہاتھوں میں تھا، لیکن جب یہ شعلہ سرد ہو گیا تو ان کو درگاہوں اور خانقاہوں میں پناہ لینا پڑی۔

فقیراں تا بہ مسجد صف کشیدند

گریبان شہنشاہاں دریدند

چو آں آتش درون سینہ افسرد

مسلماناں بدرگاہاں خزیدند

ترجمہ: جب تک مسلمان، جن میں فقیری کی شان تھی مسجد میں صف آرا رہے، وہ شہنشاہوں کے گریبان پھاڑتے رہے۔ جب فقر کی وہ آگ مسلمانوں کے سینوں میں بجھ گئی، تو وہ خانقاہوں اور درگاہوں تک محدود ہو کر رہ گئے۔

مسلماناں بخویشاں در ستیزند

بجز نقش دوئی بر دل نہ ریزند

— عشق رسول —

بنالندار کے خستے بگیرند  
ازاں مسجد کہ خود ازوے گریزند

ترجمہ: مسلمان آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ اپنے دل پر نقشِ دوئی کے سوا کوئی نقش نہیں بنا رہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ اگر کوئی (غیر مسلم) شخص اس مسجد کی، جس کے وہ کبھی نزدیک تک نہیں گئے، ایک اینٹ بھی اکھاڑ لیتا ہے تو ہ چیخ اٹھتے ہیں۔

اقبالؒ مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں اور اس کا ایک ایک ورق الٹ کر دیکھتے ہیں۔ اس میں ان کو جگہ جگہ ایسی مثالیں ملتی ہیں، جن سے ایک مسلمان کا سر شرم و ندامت سے جھک جائے۔ بہت سی ایسی چیزیں سامنے آتی ہیں، جن کو نبوتِ محمدیؐ، اس کی تعلیمات، اس کی اعلیٰ قدروں اور اصولوں سے کوئی مناسبت نہیں۔ ان کو بہت سی شرکانہ باتیں، غیر اللہ کی پرستش، جابر و ظالم بادشاہوں اور حکمرانوں کی خوشامد اور ان کی مدح سرائی کے ایسے نمونے نظر آتے ہیں، جن سے ایک غیور اور خوددار انسان کی پیشانی عرق آلود ہونے لگتی ہے۔ اقبال خاموشی کے ساتھ ایک ایک چیز دیکھتے جاتے ہیں اور آخر میں بڑی صراحت، بلاغت اور اختصار کے ساتھ کہتے ہیں کہ کچی بات تو یہ ہے کہ ان پستیوں کے ساتھ ہم ہرگز آپؐ کے شایانِ شان نہ تھے۔ ہمارا آپؐ کی ذات سے منسوب ہونا آپؐ کی شان میں بے ادبی ہے۔

جیں را پیش غیر اللہ سودیم  
چو گیراں در حضور او سرودیم  
نالَم از کسے، ی نالَم از خویش  
کہ ماشایانِ شان تو بنودیم

ترجمہ: ہم نے اپنی پیشانی کو غیر اللہ کی چوکھٹ پر تھکایا۔ اس کے حضور بت پرستوں (اور آتش پرستوں) کی طرح اس کی عظمت کے گیت گائے۔ میں کسی سے نالاں نہیں ہوں۔ اپنے آپ سے نالاں ہوں کہ ہم آپؐ کے شایانِ شان نہ تھے۔



## عشق رسول

وہ عالم اسلام پر، اسلامی ممالک پر احتیاطاً دوبارہ ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اور اپنے جائزے کا حاصل یہ بتاتے ہیں کہ ایک طرف خانقاہوں کا سبوغالی ہے۔ دوسری طرف دانش گاہیں، جدت و جرأت سے عاری ہیں۔ ان کا کام صرف یہ رہ گیا ہے کہ طے کیے ہوئے سفر کو بار بار طے کرتی رہیں۔ ادب و شعر مردہ و بے روح اور دلی جذبات سے محروم ہیں۔

سبوغے خانقاہاں خالی از  
علمد مکتب رو طے کردہ راطے  
ز بزم شاعراں افسردہ رستم  
نواہا مردہ پیروں افتد از

ترجمہ: خانقاہوں کے پیالے معرفت کی شراب سے خالی ہیں۔ دینی مدرسے اس راہ کو طے کر رہے ہیں جو پہلے ہی طے ہو چکی ہے۔ میں آج کے شاعروں کی مجلس میں گیا اور بچھے ہوئے دل سے نکلا، کیوں کہ ان کی نوا مردہ ہے۔)

وہ کہتے ہیں کہ میں نے دنیائے اسلام کا کو نہ کو نہ چھان مارا، لیکن وہ مسلمان مجھے نہ ملا جو موت سے لرزہ بر اندام ہونے کی بجائے موت اس سے لرزہ بر اندام ہو اور جو خود موت کے لیے پیام موت ہو۔

بآں بالے کہ بخییدی پریدم  
بسوز نغمہ ہائے خود تپیدم  
مسلمانے کہ مرگ ازوے بلرزد  
جہاں گردیدم و او را ندیدم

ترجمہ: میں ان بال و پر سے اڑا جو تو نے عطا کیے ہیں۔ میں اپنے نغموں کے سوز میں تڑپا۔ میں سارا جہاں گھوما ہوں، لیکن مجھے وہ مسلمان کہیں نظر نہ آیا جس سے موت کا نیتی

ہے۔





— عشق رسول —

علامہ اقبالؒ مسلمانوں کی پریشاں خاطر، آشفٹہ سری اور تنزلی کا راز فاش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہر وہ فرد یا جماعت جو دل تو رکھتی ہے لیکن دلبر نہیں رکھتی۔ محبت رکھتی ہے لیکن محبوب سے نا آشنا ہے۔ وہ اطمینان اور دل جمعی سے ہمیشہ محروم رہتی ہے۔ اس کی تمام قوتیں ضائع ہوتی ہیں اور اس کی جدوجہد کبھی ایک منزل اور ایک مرکز پر قائم نہیں رہتی۔

شے پیش خدا بگریستم زار  
مسلماناں چرا زارند و خوارند  
ندا آمد نمیدانی کہ ایں قوم  
دلے دارند و محبوبے ندارند

ترجمہ: میں ایک شب خدا کے سامنے بہت رویا کہ مسلمان کیوں زار و خوار ہیں۔ آواز آئی کہ کیا تو نہیں جانتا کہ یہ قوم دل تو رکھتی ہے لیکن محبوب نہیں رکھتی۔ یعنی اپنے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بالکل منقطع ہو گئی ہے۔

لیکن ان تمام حوصلہ شکن حالات و مشکلات کے باوجود وہ مسلمانوں سے بدل اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں، بلکہ اس مایوسی، افسردگی، دوسروں پر اعتماد کرنے اور ہر چیز کو دوسروں کی نظر سے دیکھنے کی تلقین کرنے والوں پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں اور بڑے درد سے کہتے ہیں کہ حرم کے نگہبان بت خانے کے پاسان بن بیٹھے ہیں۔ ان کا یقین مردہ و مضحل اور ان کی نگاہ مستعار اور اغیار کی رہن منت ہے۔

نگہبان حرم معمار دیر است  
یقینش مردہ و چشمش بغیر است  
ز انداز نگاہ او توں دید  
کہ نومید از ہمہ اسباب خیر است

ترجمہ: وہ مسلمان جسے حرم کا محافظ ہونا چاہیے تھا، بت کدے کی تعمیر میں لگا ہوا



— عشق رسول —

ہے۔ اس کا یقین و ایمان مردہ ہو چکا ہے اور اس کی نگاہ غیر اللہ پر لگی ہوئی ہے۔ اس کی نگاہ کے انداز سے دیکھا جاسکتا ہے کہ وہ خیر و خوبی کے تمام اسباب سے ناامید ہو چکا ہے۔  
اقبال اپنا اور اپنے زمانے کا ذکر کرتے ہیں جس سے وہ برسرِ پیکار ہیں اور جو قدم قدم پر ان کے لیے ایک مستقل آزمائش اور امتحان ہے۔

گے اتم گے متانہ خیزم  
خیزم چه خوں بے تنغ و ششیرے بریزم  
نگاہ التفاتے بر سر بام  
کہ من باعصر خویش اندر ستیزم

ترجمہ: کبھی میں گرتا ہوں اور کبھی متانہ انداز میں کھڑا ہو جاتا ہوں۔ یہ کیا خون ہے جو میں بغیر تنغ و تلوار کے بہا رہا ہوں (مراد یہ ہے کہ میرے پاس قوت اور وسائل تو نہیں، لیکن پھر بھی میں اپنے بے دین زمانے کے خلاف لڑ رہا ہوں۔ اے محبوب! چھت پر سے ایک نگاہ التفات مجھ پر ڈال کہ میں اپنے زمانے سے جنگ کر رہا ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کی پوری زندگی عصرِ حاضر سے کشمکش میں گزری۔ انھوں نے مغربی تہذیب اور مادی فلسفے کا نہ صرف انکار کیا بلکہ آگے بڑھ کر اس پر سخت تنقید کی۔ اس کو چیلنج کیا اور بڑی جرأت، روشن ضمیری اور گہرائی کے ساتھ اس کو کھوٹا ثابت کیا اور اس پر دہ فربہ کو چاک کیا، جس نے اس کی اصلی اور مکروہ شکل کو نگاہوں سے چھپا رکھا تھا۔ وہ حقیقت میں نئی نسل کے مربی، یقین و خود اعتمادی اور اسلامی شخصیت کے مکمل شعور کے حامل اور مادی بنیادوں اور مادی طرز فکر کے زبردست منکرتھے، اور ان کو یہ کہنے کا یہ حق حاصل تھا۔

چو روی در حرم دادم ازاں من  
ازد آموختم اسرار جاں من



عشق رسول

بدورِ فتنہ عصرِ کہن او  
بہ دورِ فتنہ عصرِ رواں من

ترجمہ: میں نے جلال الدین رومی کی طرح حرم میں اذان دی۔ میں نے اس سے زندگی کے اسرار و رموز سیکھے۔ پرانے زمانے کے فتنے کے وقت وہ موجود تھے اور عصرِ حاضر کے فتنے کے وقت میں موجود ہوں۔

مسلمان تا باطل آرمد است  
جبل از بحر و از خود نا امید است  
جز ایں مرد فقیرے درد مندے  
جراحت ہائے پنهانش کہ دید است

ترجمہ: مسلمان جب سے (عملی زندگی کے سمندر سے ہٹ کر) باطل پر آرام کرنے لگا ہے، سمندر سے شرمندہ اور اپنی ذات سے ناامید ہے۔ سوائے اس درد مند، مرد فقیر کے اس کے خفیہ زخموں کی جراحت کا طریقہ کسے معلوم ہے۔ (یعنی مسلمانوں کے دکھ درد کو جس طرح میں نے سمجھا ہے، اور اس کے زخموں کا علاج جس طرح میں نے کیا ہے، کوئی اور کیا کرے گا۔

اقبال مغربی تہذیب و علوم سے اپنی بغاوت، ان کے جال سے بچ نکلنے اور اپنے عقیدہ و ایمان اور اپنی روایات و اقدار کی حفاظت کا ذکر کرتے ہوئے بڑا قلندرانہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے مغربی فلسفہ و تہذیب کے آتش نمرود میں شانِ ابراہیمی کا مظاہرہ کیا۔ وہ فخر و مسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ انھوں نے ان علوم کا مغز حاصل کر لیا اور پوست پھینک دیا۔ یہی نہیں بلکہ کامیابی کے ساتھ اس کے جال سے باہر بھی آ گئے اور اس کا طلسم ہوش رُبا پاش پاش کر دیا، جس نے مشرق و مغرب دونوں کی نظر بندی کر رکھی ہے۔

طلسمِ علم حاضر را شکستم  
ربو دم دانه و دامن گستم



عشق رسول

خدا داند کہ مانندِ ابراہیم  
بہ نار اوچہ بے پروا نشستم

ترجمہ: میں نے عصرِ حاضر کے علوم کا طلسم توڑا۔ میں نے اس کے جال سے دانہ تو چن لیا اور اس کا جال توڑ دیا۔ خدا جانتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی طرح میں بھی موجودہ زمانے کی آگ میں بے پروا ہو کر بیٹھا۔

وہ اپنی اس زندگی کا ذکر کرتے ہیں جو یورپ کے بڑے بڑے شہروں میں گزری تھی اور جہاں خشک و افسردہ کتابوں، دقیق فلسفیانہ مباحث، فتنہ انگیز حسن و جمال اور دل آویز خوش نما مناظر کے سوا انھیں اور کچھ نہ مل سکا۔ اگر کوئی چیز ملی تو وہ خود فراموشی تھی، جس نے ان کو ان کے وجود سے بھی محروم کر دینا چاہا۔

بہ افرنگی بتاں دل باختم من  
ز تاب دیریاں بگداختم من  
چناں از خویشتان بیگانہ بودم  
چو دیدم خویش را شناختم من

ترجمہ: میں نے فرنگی بتوں کے پاس دل ہار دیا۔ میں بت پرستوں کی حرارت سے پگھل گیا۔ میں اپنے آپ سے اس قدر بیگانہ ہو گیا کہ جب میں نے خود کو دیکھا تو نہ پہچان سکا۔

اب بھی جب ان کو یورپ کے قیام کے دن، اور ان دنوں کی ویرانی و بے نوری یاد آتی ہے تو ان کی طبیعت پر وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ بڑے جوش کے ساتھ کہتے ہیں کہ مے خانہ مغرب میں بیٹھ کر مجھے سوائے در دسر کے اور کچھ نہ ملا۔ اس سے زیادہ بے سوز، بے نور اور بے کیف شب و روز مجھے اپنی پوری عمر میں یاد نہیں، جو ان دانش مند ان فرنگ کے ساتھ گزرے۔



— عشق رسول —

مے از میخانہ مغرب چشیدم  
بجان من کہ درد سرخریدم  
نشستم بانکویان فرنگی  
فرنگی ازاں بے سود تر روزے ندیدم!

ترجمہ: میں نے مغرب کے میخانے سے شراب پی۔ مجھے اپنی جان کی قسم، میں نے درد سر مول لیا۔ میں یورپ کے فلسفیوں اور مدبروں کے ساتھ بیٹھا۔ میں نے اس سے بڑھ کر بے سوز و بے کیف دن نہیں دیکھے۔

پھر بڑے درد کے ساتھ کہتے ہیں، میں تو آپؐ کے ایک فیض نگاہ کا پروردہ ہوں۔ اہل خرد اور اہل دانش کی یہ ساری نکتہ آفرینیاں اور لن ترانیاں میرے لیے درد سر کا سامان اور وبال جان ہیں۔ میں تو صرف آپؐ کے در کا فقیر ہوں۔ آپؐ کی گلی کا ساکس ہوں۔ مجھے کسی کے سنگ آستاں پر سر پھوڑنے اور قسمت آزمانے کی کیا ضرورت ہے۔

فقیرم از خواہم ہر چہ خواہم  
دل کوہے خراش از برگ کاہم  
مرا درس حکیمان درد سر داد  
کہ من پروردہ فیض نگاہم!

ترجمہ: میں فقیر ہوں۔ میں جو کچھ چاہتا ہوں۔ آپؐ سے چاہتا ہوں۔ میں گھاس کا تنکا ہوں۔ اس سے پہاڑ کے دل میں خراش پیدا کر۔ مجھے اہل خرد و حکمت کے درس نے درد سر دیا، کیوں کہ میں آپؐ کے فیض نگاہ کا پروردہ ہوں۔

پھر اقبال اس طبقے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو دین اور علم دین کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ اس کی خشکی، جمود، محبت اور سوزِ دروں سے محرومی، معلومات کی گرم بازاری اور اصطلاحات کی گراں باری کا شکوہ کرتے ہوئے بڑے شاعرانہ اور بلیغ انداز میں کہتے ہیں



عشق رسول

کہ اس کا صحرائے حجاز زم زم سے خالی اور بیت اللہ سے محروم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حجاز کے ریگستان کی قیمت تو بیت اللہ اور آب زم زم سے ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو ان پتے ہوئے بیابانوں اور خاموش پہاڑوں سے کیا فائدہ؟ اسی طرح وہ عالم دین کتنا مفلس و نادار ہے جو علم وافر، زبان گہرافشاں اور ذہن رسا کا مالک ہے، لیکن اس کی آنکھ محبت کے ایک آنسو اور دل کی ایک تڑپ سے بھی نا آشنا ہے۔ جس کے حصے میں اس سرزمین مقدس کی صرف سختی اور گرمی آئی ہے، خشکی اور نمی نہیں آئی۔

دلِ ملا گرفتارِ غمِ نیست  
نگاہِ ہست درِ چشمِ نئے نیست  
ازاں بگرہ ختم از مکتبِ او  
کہ در ریگِ حجازِ زم زمِ نیست

ترجمہ: ملا غمِ عشق میں گرفتار نہیں ہے۔ اس کے پاس نگاہ تو ہے لیکن آنکھ میں آنسو نہیں ہیں۔ میں اس کے مکتب سے اس لیے بھاگا، اس کے حجازی ریگ میں آب زم زم نہیں ہے۔ یعنی وہ دین کی باتیں تو ضرور کرتا ہے، لیکن اس میں خلوص اور سوز نہیں ہوتا۔

وہ کہتے ہیں کہ ایک بار میں نے غیر اللہ پر بھروسہ کیا اور اس کی سزائیں دو سومرتبہ اپنے مقام سے نیچے گرایا گیا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں زورِ شمشیر کام آتا ہے نہ حسنِ تدبیر۔ یہ تقدیر الہی اور مشیتِ ایزدی کا مقام ہے اور یہاں قدم کی ایک لغزش آدمی کو بہت نیچے گرا سکتی ہے۔

دلِ خود را بدستِ کس ندادم  
گرہ از روئے کارِ خود کشاوم  
بہ غیر اللہ کردم تکیہ یک بار  
دو صد بار از مقامِ خود قداوم



عشق رسول

ترجمہ: میں نے اپنا دل کسی کے ہاتھ میں نہیں دیا۔ میں نے اپنے چہرے پر پڑی ہوئی گرہ کو خود کھولا (میں نے ایک بار غیر اللہ پر بھروسہ کیا تھا، اس کی پاداش میں اپنے مقام سے دو سمرتبہ گرایا گیا ہوں۔

اقبال کہتے ہیں کہ اس بے سوز اور بے اخلاص عہد میں، جو منفعت و مصلحت کے سوا کسی اور چیز سے آشنا نہیں، اور جس کا مصنوعی یا حیوانی دل ہر قسم کے لطیف احساسات اور مخلصانہ جذبات سے عاری ہے، میرے لیے سوز دروں کی آگ میں جلنے اور خون جگر پینے کے سوا اور کیا ہے۔

نگاہم ز رانچہ پنم بے نیاز است  
دل از سوزِ درونم درگدازست  
من و ایں عصر بے اخلاص و بے سوز  
گو با من کہ آخر ایں چہ راز است؟

ترجمہ: میری نگاہیں جو کچھ ظاہر میں دیکھتی ہے، میں اس سے بے پروا ہوں۔ میرا دل میرے سوزِ دروں سے پگھلا ہوا ہے۔ میں ہوں اور یہ بے اخلاص اور بے سوز زمانہ۔ مجھے بتا آخر یہ کیا راز ہے؟

وہ کہتے ہیں، مشرق و مغرب کسی بھی جگہ میرا کوئی ہم دم و ہم راز نہیں۔ میں اپنا غم دل اپنے ہی دل سے کہتا ہوں اور اپنے آپ کو بہلاتا ہوں۔

من اندر مشرق و مغرب غریبم  
کہ از یارانِ محرم بے نصیبم  
غمِ خود را بگویم بادلِ خویش  
چہ معصومانہ غربت را فریبم

ترجمہ: میں مشرق اور مغرب ہر جگہ انجمنی ہوں۔ میں اپنے ہم دم و ہم ساز دوستوں



سے بے نصیب ہوں۔ اپنا غم اپنے دل ہی سے کہتا ہوں۔ میں کس معصومیت سے اپنی  
اجنبیت کو فریب دے رہا ہوں۔

اقبال کو شکایت یہ ہے کہ ان کی مخلصانہ نصیحتوں اور مشوروں پر کسی نے عمل نہیں کیا  
اور ان کے نخلِ علم کا کسی نے پھل نہ کھایا۔ انھوں نے شاعری میں جس سردشِ غیب کی ترہانی  
کی اس پر کسی نے کان نہ دھرا۔ سب ان کو ترہانِ حقیقت کے بجائے محض غزل گو اور غزل  
خواں سمجھتے رہے۔

بآں رازے کہ گفتم، پے نہ بردند  
ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند  
من اے میرِ امم داد از تو خواہم  
مرا یارانِ غزل خوانے شردند

ترجمہ: وہ راز جو میں نے مسلمانوں سے برملا کہہ دیا، اس پر وہ چلے نہیں۔ انھوں  
نے میرے کھجور کے درخت کا پھل نہیں کھایا۔ اے امیرِ امم حضرت محمدؐ میں اپنے کلام و پیام  
کی تحسین حضورؐ سے چاہتا ہوں۔ میرے احباب نے مجھے محض غزل گو شاعر سمجھ رکھا ہے۔  
اقبالؒ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کرتے ہیں کہ حضور آپؐ کا حکم  
اور فرمان تو یہ ہے کہ میں لوگوں کو زندگی اور بقائے دوام کا پیغام پہنچاؤں، لیکن یہ ناحق شناس  
مجھ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ عام شاعروں کی طرح میں بھی لوگوں کی تاریخِ وفات نکالتا اور  
قطعہٴ تاریخ کہتا رہوں۔

تو گفتمی از حیاتِ جادواں گوئے  
گبوشِ مردہٴ پیغامِ جاں گوئے  
دلے گویند ایں ناحق شناساں  
کہ تاریخِ وفات ایں و آں گوئے



— عشق رسول —

حضور! آپ کا فرمان ہے کہ حیاتِ جاوداں کی بات کروں۔ مردہ دل لوگوں کے کان میں زندگی کا پیغام ڈال دوں، لیکن ناحق شناس لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ اقبال لوگوں کے مرنے پر تاریخ و فات کہا کرو، قطعہ تاریخ لکھا کرو۔

اقبالؑ بڑے درد و سوز اور بڑی حسرت و تلخی کے ساتھ اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ علم اور پیغامِ جوان کے اشعار کی روح اور اصل قیمت ہے، اس سے لوگوں کو دلچسپی نہیں۔ اس سلسلے میں لوگوں نے بڑی قناعت اور زہد کا ثبوت دیا ہے۔ اقبالؑ کہتے ہیں کہ اپنی ساری متاع کھول کر میں نے بازار میں رکھ دی، لیکن کوئی اس جنسِ نایاب کا خریدار نہ ملا۔ میں نے ارمغانِ دل پیش کرنا چاہا، لیکن اس کا بھی کوئی قدر داں نظر نہ آیا۔ مجھ سے زیادہ غریب الوطن، بیگانہ اور تنہا اس دنیا میں اور کون ہو سکتا ہے۔

دلے بر کف نہدام، دلبرے نیست  
متاعے داشتم، غارت گرے نیست  
درون سینہ من، منزله گیر  
مسلمانے زمن تنہا ترے نیست

ترجمہ: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے اپنا دل اپنی ہتھیلی پر رکھا کہ ہے کوئی لے جانے والا، لیکن اس کو لے جانے والا کوئی نہیں۔ میرے پاس دولت تھی، لیکن میری دولت کو لوٹنے والا کوئی نہ تھا۔ یا رسول اللہ! آپ میرے سینے میں قیام فرمائیے۔ مسلمان ہوں، مجھ سے زیادہ تنہا اور کوئی نہیں ہے۔





## باب نمبر ۹

# مومن



www.KitaboSunnat.com

خودی، فقر اور عشق جس شخص میں جمع ہوں گے، وہ اقبالیات کی اصطلاح میں ”مومن“ کہلائے گا۔ اپنی ایک فارسی غزل میں ”مومن“ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”تجھ پر مجھے کمال حیرت ہے کہ آفاق تو تجھ سے روشن ہیں، لیکن تیری ذات ہی درمیان سے غائب ہے۔ تم کب تک غفلت، گمنامی و جہالت کی زندگی گزارتے رہو گے۔ تمہاری روشنی نے دنیائے قدیم کو روشن کیا اور تمہارا وجود ماضی کی تاریک رات کے لیے منارہ نور بن کر رہا۔ تمہاری آستین میں ہمیشہ ”ید بیضا“ موجود رہا۔ تم آج گھر وندوں میں گھوم رہے ہو لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ تم انہیں پھلانگ بھی سکتے ہو۔ تم تو اس وقت بھی تھے جب یہ کائنات نہ تھی اور اس وقت بھی رہو گے، جب یہ نہ ہوگی۔ اے مرد مومن! تو موت سے ڈرتا ہے، حالانکہ موت کو تجھ سے ڈرنا چاہیے۔ تمہیں جاننا چاہیے کہ آدمی کی روح کی جدائی سے نہیں ہوتی بلکہ ایمان کی کمی اور یقین سے محرومی سے ہوتی ہے۔“

اے مرد مومن! تو ناموس ازل کا امین و پاسباں اور خدائے لم یزل کا راز داں ہے۔ تیرا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے۔ تیری اٹھان مٹی سے ہے، لیکن تجھی سے اس عالم کا وجود و بقا متعلق ہے۔ مے خانہ یقین سے پی اور ظن و تخمین کی پستیوں سے نکل کر بلند ہو جا۔ فرنگ کی دل آویزی کی نہ داد ہے نہ فریاد ہے، جس نے عقل و دل دونوں کو مسحور و مخمور اور ناکارہ بنا دیا ہے۔ فریاد اُن بازی گروں سے جو کبھی ناز و ادا سے پکڑتے ہیں اور کبھی بیڑیوں میں جکڑتے ہیں، کبھی شیریں کا پارٹ ادا کرتے ہیں اور کبھی پرویز کا روپ بھرتے ہیں۔ دنیا ان کی تباہ کاریوں سے ویراں ہو گئی ہے۔

اے مرد مومن! اے بانی حرم! اے معمارِ کعبہ! اور اے فرزندِ ابراہیم، ایک بار پھر دنیا کی تعمیر کے لیے اٹھ اور اپنی گہری نیند سے بیدار ہو۔



مومن

اے غنچہ خوابدیده چو زگس گراں خیز  
کاشانہ مارفت بتاراج عمار خیز  
از نالہ مرغ چمن، از بانگ ازاں خیز  
از گرمی ہنگامہ آتش نفساں خیز!  
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!  
”مومن“ سے متعلق اردو اشعار کا انتخاب ملاحظہ ہو۔

بندۂ مومن کا دل نیم و ریا سے پاک ہے  
تو تو فرماں روا کے سامنے بے باک ہے!

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں  
جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں  
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا؟  
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں  
یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم  
جہاد زندگانی میں ہیں، یہ مردوں کی شمشیریں ۲

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث  
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے ۳

۱۔ ا۔ سید کی لوحِ تربت (بانگِ درا..... ۳۸)

۲۔ طلوعِ اسلام (بانگِ درا..... ۲۱۳)

۳۔ غزل نمبر ۱۰ (بالِ جبریل..... ۲۶۲)



— مومن —

کافر ہے مسلمان، تو نہ شاہی نہ فقیری  
مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی  
کافر ہے تو ششیر پہ کرتا ہے بھروسا  
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی!  
کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیرِ مسلمان  
مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الہی!

یہی زمانہ حاضر کی کائنات ہے کیا؟  
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک  
تو بے بصر ہو تو یہ مانع نگاہ بھی ہے  
وگرنہ نہ آگ ہے مومن، جہاں خس و خاشاک  
زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ  
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک  
جہاں تمام ہے میراث، مردِ مومن کی  
مرے کلام پہ حجت ہے نکتہٴ لولاک<sup>۱</sup>

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری  
رہا صوفی، گئی روشن ضمیری

۱۔ غزل نمبر ۱۲ (بال جبریل..... ۲۶۳)

۲۔ غزل نمبر ۳۶ (بال جبریل..... ۲۸۸)

مومن

خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ  
نہیں ممکن امیری بے فقیری!

تھ سے ہوا آشکار بندہ مومن کا راز  
اس کے دنوں کی تپش، اس کے شبوں کا گداز  
اس کا مقام بلند، اس کا خیال عظیم  
اس کا سرور، اس کا شوق، اس کا نیاز، اس کا ناز  
ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ  
غالب و کار آفرین، کارکش، کارساز  
خاکی و نوری نہاد، بندہ مولا صفات  
ہر دو جہاں سے غنی، اس کا دل بے نیاز  
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل  
اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز  
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو  
رزم ہو یا یزم ہو، پاک دل و پاک باز  
نقطہ پر کارِ حق، مردِ خدا کا یقیں  
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و حجاز  
عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ  
حلقہ آفاق میں گرمی محفل ہے وہ ۛ



یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے  
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی  
دونیم، ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا  
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی  
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو  
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی  
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن  
نہ مالِ غنیمت، نہ کشورِ کشائی  
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کردے  
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتندر میں  
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے  
نگاہِ مسلمان کو تلوار کر دے

عقابِ روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں  
نظر آتی ہے اس کو اپنی منزلِ آسمانوں میں  
نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے  
امیدِ مردِ مومن ہے، خدا کے راز دانوں میں

۱۔ طارق کی دعا (بال جبریل..... ۳۲۰)

۲۔ ایک نو جوان کے نام (بال جبریل..... ۳۳۳)



مومن

یہ سحر جو کبھی فردا ہے، کبھی ہے امروز  
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا  
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شیتان وجود  
ہوتی ہے بندہ مومن کی اذال سے پیدا

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم  
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن  
افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش  
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن  
چتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں  
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن  
کہتے ہیں فرشتے کہ دلاویز ہے مومن  
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن  
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان  
تہاری و غفاری و قدوسی و جبروت  
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان  
مسائیہ جبریل امیں بندہ خاکی  
ہے اس کا نشیمن، نہ بخارا نہ بدخشان

۱۔ صبح (ضرب کلیم..... ۳۹۴)

۲۔ مومن (ضرب کلیم..... ۳۲۱)



— مومن —

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے دنیا میں بھی میزان، قیامت میں بھی میزان جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز آہنگ میں یکتا صفت سورہ رحمن بنتے ہیں مری کارگر فکر میں انجم لے اپنے مقدر کے ستارے کو تو پہچان لے

پابندی تقدیر کہ پابندی احکام یہ مسئلہ مشکل نہیں، اے مرد خرد مند اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خورسند تقدیر کے پابند نباتات و جمادات مومن فقط احکام الہی کا ہے پابند

پرورش دل کی اگر مد نظر ہے تجھ کو مرد مومن کی نگاہ غلط انداز ہے بس

۱۔ مرد مسلمان (ضرب کلیم.....۴۴۲)

۲۔ احکام الہی (ضرب کلیم.....۴۴۶)

۳۔ محراب گل افغان کے افکار (ضرب کلیم.....۵۴۳)



### مومن

اللہ کو پامردی مومن پہ بھروسا  
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا  
تقدیر ام کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا  
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ لے

مقام بندہ مومن کا ہے ورائے سپہر  
زمین سے تابہ ثریا تمام لات و منات  
حریم ذات ہے اس کا نفیس ابدی  
نہ تیرہ خاک لحد ہے، نہ جلوہ گاہ صفات لے

حدیث بندہ مومن دل آویز!  
جگر پر خون، نفس روشن، نگہ تیز  
میسر ہو کسے دیدار اس کا  
کہ ہے وہ رونق محفل کم آمیز لے

گر صاحب ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب  
دیں بندہ مومن کے لیے موت ہے یا خواب لے

۱۔ بڑھے بلوچ کی نصیحت بیٹے (ارمغانِ حجاز..... ۵۴۲)

۲۔ مسعود مرحوم (ارمغانِ حجاز..... ۵۵۰)

۳۔ رباعی (ارمغانِ حجاز..... ۵۵۴)

۴۔ ملا زادہ یحیٰی کشمیری کا بیاض (ارمغانِ حجاز ۵۵۶)





باب نمبر ۱۰

شاہین





اقبال کے ہاں مردِ مومن، نوجوان، فرزندِ کوہستانی، نئی نسل یا نژادِ نو کا ایک اور نام بھی ہے اور وہ ہے ”شاہین“، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اقبال نے اپنے کلام میں اپنے ”مثالی نوجوان“ کو عموماً شاہین کہہ کر پکارا ہے۔ اس لیے کہ ایک مثالی نوجوان میں اقبال جس قسم کے اوصاف دیکھنے کے آرزو مند ہیں وہ انھیں شاہین میں نظر آتے ہیں۔ اقبال نے خود ایک جگہ بیان کیا ہے کہ ”شاہین“ کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فکر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ خود دار و غیرت مند ہے، کسی اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ بلند پرواز ہے، خلوت پسند ہے اور تیز نگاہ ہے۔ چنانچہ اقبال نے جگہ جگہ شاہین (جرہ شاہین، شاہین کا فوری، باز، جرہ باز اور عقاب وغیرہ) کی صفات کا ذکر کیا ہے، لیکن اس ذکر سے ان کی مراد نوجوانوں ہی کی سیرت و کردار ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے  
کبوتر کے تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا  
تیرے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے  
مسلمان سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے۔

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ بیاباں میں  
کہ شاہین کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی ۛ

۱۔ طلوعِ اسلام (بانگِ درا..... ۲۱۱)

۲۔ غزل نمبر ۱۰ (بالِ جبریل..... ۲۳۶)

### شاہین

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کر گسوں میں  
اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی ۱

شکایت ہے مجھے یارب! خداوندانِ مکتب سے  
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا  
بہت مدت کے ننھیروں کا اندازِ نگہ بدلا  
کہ میں نے فاش کر ڈالا، طریقہ شاہبازی کا ۲

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر  
یہاں فقط سر شاہین کے واسطے ہے کلاہ ۳

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا  
یہ اک مردِ تن آساں تھا، تن آسانوں کے کام آیا  
اسی اقبال کی میں جستجو کرتا رہا برسوں  
بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہیں زیرِ دام آیا ۴

۱۔ غزل نمبر ۱۳ (بالِ جبریل..... ۲۴۹)

۲۔ غزل نمبر ۸ (بالِ جبریل..... ۲۶۰)

۳۔ غزل ۲۳ (بالِ جبریل..... ۲۷۲)

۴۔ غزل نمبر ۳۵ (بالِ جبریل..... ۲۸۱)



نماہین

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر  
چمن اور بھی، آشیاں اور بھی ہیں  
اگر کھو گیا اک نشین تو کیا غم  
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں  
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا  
تیرے سامنے آسمان اور بھی ہیں  
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا  
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں !

ترا جوہر ہے نوری، پاک ہے تو  
فروغ دیدہ افلاک ہے تو  
ترے صید زبوں افرشتہ و حور  
کہ شاہیں شہ لولاک ہے تو

جوانوں کو مری آہ سحر دے  
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے  
خدایا آرزو میری ہے یہی ہے  
مرا نور بصیرت عام کر دے

۱۔ غزل نمبر ۴۰ (بال جبریل..... ۲۸۴)

۳۔ رباعی (بال جبریل..... ۳۰۲)

۳۔ رباعی (بال جبریل..... ۳۰۳)





### شہزادین

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے  
کجھک فر و مایہ کو شاہیں سے لڑا دو  
سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ  
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے، مٹا دو

نہیں ہے تیرا نشین قصرِ سلطانی کے گنبد پر  
تو شاہیں ہے بسرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

بچہ 'شاہین' سے کہتا تھا عقابِ سالِ خورد  
اے ترے شہپر پہ آساںِ رفعتِ چرخِ بریں  
ہے شاب اپنے لہو کی آگ میں جینے کا نام  
سختِ کوئی سے ہے تلخِ زندگانی انگلیں  
جو کبوتر پر جھپٹے میں مزا ہے اے پر  
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں ہے

پرداز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں  
کرگس کا جہاں اور ہے، شاہیں کا جہاں اور

۱۔ فرمانِ خدا (بالِ جبریل ..... ۳۲۵)

۲۔ ایک نوجوان کے نام (بالِ جبریل ..... ۳۲۵)

۳۔ نصیحت (بالِ جبریل ..... ۳۳۶)

۴۔ حال و مقام (بالِ جبریل ..... ۳۶۷)



— شاہین —

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو  
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارت لے

.....

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارہ  
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ  
بیاباں کی خلوت خوش آتی ہے مجھ کو  
ازل سے ہے فطرت مری راہبانہ  
نہ باد بہاری، نہ گلچیں، نہ بلبل  
نہ بیماری نعمہ عاشقانہ  
خیابانوں سے ہے پرہیز لازم  
ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ  
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری  
جواں مرد کی ضربت غازیانہ  
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں  
کہ ہے زندگی باز کی زاهدانہ  
جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا  
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ  
یہ پورب، یہ پچھتم چکوروں کی دنیا  
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ



— شاہین —

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں  
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ ۱

شاہین کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا  
پُر دم ہے اگر تُو، تو نہیں خطرہ افتاد ۲

بہتر ہے کہ بے چارے مولوں کی نظر سے  
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات  
آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال  
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات ۳

میں کارِ جہاں سے نہیں آگاہ و لیکن  
اربابِ نظر سے نہیں پوشیدہ کوئی راز  
کر تو بھی حکومت کے وزیروں کی خوشامد  
دستور نیا اور نئے دور کا آغاز  
معلوم نہیں، ہے یہ خوشامد کہ حقیقت  
کہہ دے کوئی اُلُو کو اگر ”رات کا شہباز“ ۴

۱۔ شاہین (بال جبریل..... ۳۷۴)

۲۔ اسرارِ پیدا (ضربِ کلیم..... ۴۴۲)

۳۔ ہندی کتب (ضربِ کلیم..... ۴۴۷)

۴۔ خوشامد (ضربِ کلیم..... ۴۹۷)



شاهین

زاغ کہتا ہے نہایت بدنما ہیں تیرے پر  
شپرک کہتی ہے تجھ کو کور چشم و بے ہنر  
لیکن اے شہباز، یہ مرغاب صحرا کے اچھوت  
ہیں فضائے نیلگوں کے بیچ و خم سے خبر  
ان کو کیا معلوم اس طائر کے احوال و مقام  
روح ہے جس کی دم پرواز، سرتاپا نظر لے

زاغ دشتی ہو رہا ہے ہم سر شاہین و چرخ  
کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاج روزگار

۱۔ محراب گل افغان کے انکار (ضرب کلیم..... ۵۲۳)

۲۔ ایلیس کی مجلس شوریٰ (ارمغان مجاز..... ۵۲۷)







باب نمبر ۱۱

# علم و عقل





علم اور چیز ہے، تعلیم اور چیز ہے۔ اقبال علم اور عقل اور حکمت کے مد مقابل یا ان سے بھی بالاتر عشق کو خیال کرتے ہیں۔ یا یوں سمجھیے کہ علم کو عشق کے تابع خیال کرتے ہیں۔ وہ معرفت اور عرفان کے قائل ہیں اور حصول علم کا مقصد بھی یہی خیال کرتے ہیں کہ عالم کو عرفان ذات حاصل ہو جائے۔

علم تجھ سے، تو معرفت مجھ سے  
تو خدا ہو، خدا نما ہوں میں  
علم کی انتہا ہے بے تابلی  
اس مرض کی مگر دوا ہوں میں

علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن، گوہر بدست  
وائے محرومی! خرف چین لب ساحل ہوں میں

ہر مسلمان رگ باطل کے لیے نشتر تھا  
اس کے آئینہ ہستی میں عمل جو ہر تھا  
جو بھروسا تھا، اسے قوت بازو پر تھا  
ہے تھیں موت کا ڈر، اس کو خدا کا ڈر تھا  
باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو  
پھر پسر قابل میراث پدر کیوں کر ہو

۱۔ عقل و دل (بانگ درا..... ۲۹)

۲۔ غزل (بانگ درا..... ۸۰)

۳۔ جواب شکوہ (بانگ درا..... ۱۵۸)



— علم و عقل —

ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہاں گیری  
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتہ ایمان کی تفسیریں  
براجیہی نظر پیدا، مگر مشکل سے ہوتی ہے  
ہوں چھپ چھپ کے سینوں میں نکلتی ہے تصویریں!

عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے؟  
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی  
سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات  
ہو نہ روشن، تو سخن مرگِ دوام اے ساقی ۲

دل بیٹا بھی کر خدا سے طلب  
آنکھ کا نور، دل کا نور نہیں  
علم میں بھی سرور ہے لیکن  
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں ۳

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل  
اگر ہو عشق سے محکم تو صورتِ اسرافیل ۴

۱۔ طلوع اسلام (بانگ درا..... ۲۱۴)

۲۔ غزل نمبر ۸ (بال جبریل..... ۲۳۵)

۳۔ غزل نمبر ۴۰ (بال جبریل..... ۲۶۹)

۴۔ غزل نمبر ۴۲ (بال جبریل..... ۲۸۵)



— علم و عقل —

یہ علم ، یہ حکمت ، یہ تدبیر ، یہ حکومت  
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات ۱۔

چشمِ بینا سے ہے جاری جوئے خوں  
علمِ حاضر سے ہے دیں، زار و زبوں  
علمِ را بر تن زنی مارے بود  
علمِ را بر دل زنی یارے بود ۲۔

علم و حکمت کا طے کیوں کر سراغ؟  
کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ؟  
علم و حکمت زاید از نانِ حلال  
عشق و رقت آید از نانِ حلال ۳۔

شہیدِ محبت نہ کافر، نہ غازی  
محبت کی رکیں نہ ترکی ، نہ تازی  
وہ کچھ اور شے ہے، محبت نہیں ہے  
سکھاتی ہے جو غزنوی کو ایازی  
یہ جوہر اگر کار فرما نہیں ہے  
تو ہیں علم و حکمت فقط شیشہ بازی ۴۔

۱۔ لینن خدا کے حضور میں (بال جبریل..... ۳۲۲) ۲۔ ہمدردیہ (بال جبریل..... ۳۲۶)

۳۔ ہمدردیہ (بال جبریل..... ۳۵۲) ۴۔ محبت (بال جبریل..... ۳۵۸)

علم وعقل

علم نے مجھ سے کہا ، عشق ہے دیوانہ پن  
عشق نے مجھ سے کہا ، علم ہے تخمین و ظن  
بندہ تخمین و ظن ، کرم کتابی نہ بن  
عشق سراپا حضور ، علم سراپا حجاب ل

چمن میں تربیت غنچہ ہو نہیں سکتی  
نہیں ہے قطرہ شبنم اگر شریک نسیم!  
وہ علم ، کم بصری جس میں ہمکنار نہیں  
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم ۲

زندگی کچھ اور شے ہے ، علم ہے کچھ اور شے  
زندگی سوزِ جگر ہے ، علم ہے سوزِ دماغ  
علم میں دولت بھی ہے ، قدرت بھی ہے ، لذت بھی ہے  
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ ۳

وہ علم نہیں ، زہر ہے احرار کے حق میں  
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کف جو  
ناداں! ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے  
اسبابِ ہنر کے لیے لازم ہے تگ و دو

۲۔ علم و عشق (بال جبریل..... ۳۹۹)

۳۔ علم اور دین (ضربِ کلیم..... ۲۰۴)

۳۔ تربیت (ضربِ کلیم..... ۴۴۸)



علم وعقل

فطرت کے نوا میں یہ غالب ہے ہنرمند  
شام اس کی ہے مانند سحر صاحبِ پرتو ۱

یہ علم، یہ حکمت، یہ سیاست، یہ تجارت  
جو کچھ ہے وہ ہے فکرِ ملوکانہ کی ایجاد  
اللہ! ترا شکر کہ یہ خطہٴ پُر سوز  
سوداگرِ یورپ کی غلامی سے ہے آزاد ۲

غلام قوموں کے علم و عرفان کی ہے یہی رمزِ آشکارا  
زمین اگر تنگ ہے تو کیا ہے، فضا ہے گردوں ہے بے کرانہ  
خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی کہ خود فریبی؟  
عمل سے فارغ ہوا مسلمان بنا کے تقدیر کا بہانہ ۳

۱۔ محرابِ گل افغان کے افکار (ضربِ کلیم..... ۵۲۰)

۲۔ دوزخی کی مناجات (ارمغانِ حجاز..... ۵۲۸)

۳۔ نکلا زادہ ضیفم لولابی کشمیری کا بیاض (ارمغانِ حجاز..... ۵۶۳)





باب نمبر ۱۲

# مغربی تعلیم



www.KitaboSunnat.com

اقبال جدید مغربی تعلیم کے سخت خلاف ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تعلیم ہمارے نوجوانوں میں تعطل، جمود، آرام طلبی اور لذت کوٹی پیدا کرتی ہے اور زندگی کو بحرِ منجمد بنا دیتی ہے۔ جدید مغربی تعلیم مغربی استعمار کا ہتھکنڈا بن کر مشرق میں اس کی تہذیب، اس کے افکار اور اس کے مستقبل کے لیے نوآبادیات کی زمین ہموار کرتی ہے اور نوجوانوں کو مغرب زدہ بناتی ہے اور بلند معیار زندگی اور اقتصادی ترقی کی ہوس پیدا کر کے نئے نئے مسائل سامنے لاتا ہے۔ مغربی تعلیم کفر والی دھیلیاتی ہے۔ ذہنی انتشار اور فکری الجھاؤ پھیلاتی ہے۔

اقبالؒ کہتے ہیں کہ ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کا وجود اس کا ذاتی وجود نہیں، بلکہ وہ یورپ (اور اب امریکا) کی پرچھائیں ہے اور اس کی مصنوعی زندگی بھی مستعار ہے۔ نئی نسل جسم و ماڈے کا وہ ڈھانچا ہے جسے مغربی معماروں نے تعمیر کیا ہے، لیکن اس میں روح نہیں ہے۔ نئی نسل کی نگاہ میں خدا کا وجود معدوم ہے، اور یہ اسلامی طرز فکر و تعلم کی نفی ہے۔ اسلام کا جوہر ذاتِ باری تعالیٰ بلکہ اس کی توحید میں ہے۔ اگر ہمارے نوجوانوں کی تعلیم سے یہ نکتہ توحید ہی خارج کر دیا جائے تو انسان محض مٹی کا پیکر رہ جاتا ہے۔

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں  
ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھانا کہیں  
وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں  
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا، ہنگامہ محشر یہاں !

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر  
لبِ خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ



### مغربی تعلیم

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم  
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

مرشد کی یہ تعلیم تھی، اے مسلم شوریدہ سر  
لازم ہے رہرو کے لیے دنیا میں سامانِ سر  
اس دور میں تعلیم ہے امراضِ ملت کی دوا  
ہے خونِ فاسد کے لیے تعلیمِ مثلِ نیشتر  
رہبر کے ایمان سے ہوا، تعلیم کا سودا مجھے  
واجب ہے صحرا گرد پر، تعمیلِ فرمانِ خضر  
لیکن نگاہِ نکتہ بین دیکھے زبوں بختی مری  
رفتم کہ خار از پاکشم، محل نہاں شد از نظر  
یک لحظہ غافلِ عشتم و صد سالہ را ہم دور شد

تعلیمِ پیرِ فلسفہ مغربی ہے یہ  
ناداں ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش  
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا  
ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش  
محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی  
اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش  
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام  
ہے جس سے آدمی کی تخیل کو انتعاش

۱۔ تعلیم اور اس کے نتائج (ہانگ درا۔۔۔ ۱۶۳)

۲۔ مسلمان اور تعلیمِ جدید (ہانگ درا۔۔۔ ۱۹۰)



مصری تعلیم

باہر کمال اند کے آشفگی خوش است  
ہر چند عقل کل شدہ، بے جنوں مباح!

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے  
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر  
لیکن جناب شیخ کو معلوم کیا نہیں؟  
مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود بے اثر  
تبغ و تفنگ دس مسلمانوں میں ہے کہاں  
ہو بھی تو دل میں موت کی لذت سے بے خبر  
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل  
کہتا ہے کون اسے کہ مسلمان کی موت مر  
تعلیم اس کو چاہیے ترک جہاد کی  
دنیا کو جس کے پنجہ خونیں سے ہو خطر  
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے  
یورپ زرہ میں ڈوب گیا، دوش تا کر  
ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے  
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر  
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات  
اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگذر

مضرب تعلیم

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا، جس نے  
قبض کی روح تری، دے کے تجھے فکرِ معاش  
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا  
زندگی موت ہے، کھودیتی ہے جب ذوقِ خراش  
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا  
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش  
فیضِ فطرت نے تجھے دیدہ شاہیں بخشا  
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہِ خفاش  
مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو  
خلوتِ کوہِ بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش۔

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی  
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام  
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر  
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام  
مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق  
عقل بے ربطی افکار سے مشرق میں غلام۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے  
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

۱۔ مدرسہ (ضربِ کلیم..... ۳۵۱)

۲۔ عصر حاضر (ضربِ کلیم..... ۳۵۰)



مضرب تعلیم

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو  
کتاب خواں ہے، مگر صاحب کتاب نہیں!

دنیا ہے روایات کے پھندوں میں گرفتار  
کیا مدرسہ، کیا مدرسہ والوں کی ٹیگ و دو  
کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت  
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

ملے گا منزل مقصود کا اسی کو سراغ  
اندھیری شب میں ہے چپتے کی آنکھ جس کا چراغ  
میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو  
نہیں ہے بندہ حر کے لیے جہاں میں فراغ  
کیا ہے تجھ کو کتابوں نے کور ذوق اتنا  
صبا سے بھی نہ ملا تجھ کو بوئے گل کا سراغ

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز  
ہو نہ اخلاص تو دعویٰ نظر لاف و غزاف

۱۔ طالب علم (ضرب کلیم..... ۲۵۰)

۲۔ اساتذہ (ضرب کلیم..... ۲۵۳)

۱۔ غزل (ضرب کلیم..... ۲۵۳)

مضرب تعلیم

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم  
ایک سازش ہے فقط دینِ مروت کے خلاف  
اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے  
قوم جو کہ نہ سکی اپنی خودی سے انصاف  
فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے  
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

جوہر میں ہو لا اِلهَ تو کیا خوف  
تعلیم ہو گو فرنگیانہ

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو  
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر  
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب  
سونے کا ہالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

زجاج گر کی دکان شاعری و مٹائی  
ستم ہے خوار پھرے، دشت و در میں دیوانہ

۱۔ دین و تعلیم (ضرب کلیم..... ۴۵۴)

۲۔ جاوید سے (ضرب کلیم..... ۴۵۵)

۳۔ نصیحت (ضرب کلیم..... ۵۱۰)



مصری تعلیم

کے خبر کہ جنوں میں کمال اور بھی ہیں  
کریں اگر اسے کوہ و کمر سے بیگانہ  
ہجوم مدرسہ بھی سازگار ہے اس کو  
کہ اس کے واسطے لازم نہیں ہے ویرانہ !

اے شیخ بہت اچھی نکتہ کی فضا لیکن  
نبی ہے بیاباں میں فاروقیؓ و سلمانیؓ  
صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے حریف اس کا  
تلوار ہے تیزی میں صہبائے مسلمانیؓ

۱۔ جنوں (ضرب کلیم.....۲۶۵)

۲۔ غزل نمبر ۲۰ (ضرب کلیم.....۵۳۰)







باب نمبر ۱۳

# مغربی تہذیب







مغرب کی مادی تہذیب اور اس کی پیدا کردہ مشکلات اور مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے اقبال اپنی تصنیف ”تشکیل جدید الہیات اسلامیہ“ میں لکھتے ہیں۔ ”حاصل کلام یہ کہ عصر حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ہیں، ان کے زیر اثر انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے، یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ خیالات اور تصورات کی جہت سے دیکھیے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے۔ سیاسی اعتبار سے نظر ڈالیے تو افراد افراد سے دست و گریباں ہیں۔ اس میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اپنی بے رحم انسانیت اور ناقابل تسکین ہوس زر پر قابو حاصل کر سکے۔ یہ باقی ہیں جن کے زیر اثر زندگی کے اعلیٰ مراتب و اقدار کے لیے مغربی تہذیب کی جدوجہد بہ تدریج ختم ہو رہی ہے۔“

بہر حال یہ وطنیت ہو یا لادینی اشتراکیت، دونوں مجبور ہیں کہ ہر کسی کو نفرت، بدگمانی اور غم و غصے پر اکسائیں۔ حالاں کہ اس طرح انسان کا باطن اور ضمیر مردہ ہو جاتا ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی روحانی طاقت اور قوت کے مخفی سرچشمے تک پہنچ سکے۔ جب تک انسان کو اپنے آغاز و انجام کی کوئی نئی جھلک نظر نہیں آتی، وہ کبھی اس معاشرے پر غالب نہیں آسکتا، جس میں باہمی مقابلے اور مسابقت نے ایک بڑی مہیب اور غیر انسانی شکل اختیار کر رکھی ہے، نہ اس تہذیب و تمدن پر جس کی روحانی وحدت اس کی مذہبی اور سیاسی قدروں کے اندرونی تصادم سے پارہ پارہ ہو چکی ہے۔“

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکان نہیں ہے  
کھرا بنے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زریع عیار ہوگا  
تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی  
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپایدار ہوگا۔

مہربانی تہذیب

حرارت ہے بلا کی، بادۂ تہذیب حاضر میں  
 بھڑک اٹھا بھبھو کا، بن کے مسلم کا تنِ خاکی  
 کیا ذرہ کو جگنو، دے کے تابِ مستعار اس نے  
 کوئی دیکھے توشوخی آفتابِ جلوہ فرما کی  
 نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے  
 یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی، یہ بے باکی  
 تغیر آگیا ایسا تدبیر میں، تخیل میں  
 ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی  
 کیا گم تازہ پروانوں نے اپنا آشیان لیکن  
 مناظر دل کشا دکھلا گئی ساحر کی چالاکی  
 حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا  
 رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوس ناکی  
 فردِ شمعِ نو سے بزمِ مسلم جگمگا اٹھی  
 مگر کہتی ہے پروانوں سے، میری کہنے ادراکی  
 تو اے پروانہ! ایں گرمیِ رُشحِ مخفلے داری  
 چومن در آتشِ خود سوز، اگر سوزِ دلے داری“۔

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ  
 ”خواجگی“ نے خوب چن چن کے بنائے مسکرات



مہرِی تہذیب

کٹ مرا ناداں، خیالی دیوتاؤں کے لیے  
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا تقدِ حیات  
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار  
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات  
اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے  
مشرق و مغرب میں، تیرے دور کا آغاز ہے۔

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہر یاری ہے  
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انسانی کا شکاری ہے  
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی  
یہ صناعی مگر جھوٹے گلوں کی ریزہ کاری ہے  
وہ حکمت ناز تھا جس پر خرد مندِ مغرب کو  
ہوس کے مہچے خوئیں میں تیغِ کارزاری ہے  
تدبیر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا  
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے  
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی  
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔

کچھ غم نہیں جو حضرت واعظ ہیں تنگ دست  
تہذیب نو کے سامنے سر اپنا خم کریں

۱۔ حضر راہ (بانگ درا..... ۲۰۶)

۲۔ طلوع اسلام (بانگ درا..... ۲۱۶)



### مہربانی تہذیب

ردِ جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا  
تردید حج میں کوئی رسالہ رقم کریں ۱

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ  
دفع مرض کے واسطے پل پیش کیجیے  
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض  
دل چاہتا تھا ہدیہ دل پیش کیجیے  
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق  
کہتا ہے ماسٹر سے کہ ”بل پیش کیجیے“ ۲

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں  
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے  
الکشن، ممبری، کونسل، صدارت  
بنائے خوب آزادی نے پھندے  
میاں بھار بھی چھیلے گئے ساتھ  
نہایت تیز ہیں یورپ کے رندے ۳

لبالب شیعہ تہذیب حاضر ہے مے لا سے  
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیانا ۴

۱۔ نظریات (بانگ درا..... ۲۲۵)

۲۔ نظریات (بانگ درا..... ۲۲۵)

۳۔ نظریات (بانگ درا..... ۲۳۰)



### مہربی تہذیب

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دتی نے  
بہت نیچے سروں میں ہے، ابھی یورپ کا داویلا  
فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی  
مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختی خارا لے

خداوند! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں  
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری  
مجھے تہذیب حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی  
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری  
تو اے مولائے یشرب، آپ میری چارہ سازی کر  
مری دانش ہے افرنگی، میرا ایمان ہے زقاری ۲

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش  
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا نہ دوش  
کس کو معلوم ہے ہنگامہ فردا کا مقام  
مسجد و مکتب و مے خانہ ہیں مدت سے خموش  
میں نے پایا ہے اسے اٹک سحر گاہی میں!  
جس دُر تاب سے خالی ہے صدف کی آغوش  
نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں  
چہرہ روشن ہو تو کیا حاجت گلگونہ فروش

۱۔ تادرشاہ غازی (بال جریل..... ۲۵۴)

۲۔ غزل نمبر ۱۴ (بال جریل..... ۲۶۵)

مہرِی تہذیب

صاحب ساز کو لازم ہے کہ غافل نہ رہے  
گا ہے گا ہے غلط آہنگ بھی ہوتا ہے سروش لے

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے  
حرم کا راز توحیدِ اُم ہے  
تہی وحدت سے ہے اندیشہِ غرب  
کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے لے

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے  
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنادو  
تہذیبِ نوی کارگرِ شیشہ گراں ہے  
آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھادو سچ

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی  
ساتی کہاں اس فقیری میں میری  
خصوصیت تھی سلطانی و راہی میں  
کہ وہ سربلندی ہے یہ سرِ بزی  
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا  
چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیروی

۱۔ غزل۔ ۵۶ (بالِ جبریل ..... ۲۹۴)

۲۔ رباعی (بالِ جبریل ..... ۳۰۰)

۳۔ فرمانِ خدا فرشتوں سے (بالِ جبریل ..... ۳۲۵)



ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی  
 ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری  
 دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی  
 دوئی چشم تہذیب کی نابصیری  
 یہ اعجاز ہے ایک صحرائیں کا  
 بشیری ہے آئینہ دارِ نذیری  
 اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی  
 کہ ہوں ایک جہیزی و اردشیری لے

زمانے کے انداز بدلے گئے  
 نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے  
 ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ  
 کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ  
 پرانی سیاست گری خوار ہے  
 زمیں میر و سلطان سے بیزار ہے  
 گیا دور سرمایہ داری گیا  
 تماشا دکھا کر مداری گیا  
 گراں خواب چینی سنبھلنے لگے  
 ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے  
 مسلمان ہے توحید میں گرم جوش  
 مگر دل ابھی تک ہے، زغار پوش



مغربی تہذیب

تمدن، تصوف، شریعت، کلام  
بتان عجم کے پجاری تمام  
حقیقت خرافات میں کھو گئی  
یہ امت روایات میں کھو گئی ۱

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب  
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عقیف  
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید  
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوقِ لطیف ۲

یہ عیش فراواں، یہ حکومت، یہ تجارت  
دل سینہ بے نور میں محروم تسلی  
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے  
یہ وادی ایمن نہیں شایانِ تحلی  
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ  
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متوتی ۳

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر  
ہے کتنی زہر ناک ابلی سینیا کی لاش  
ہونے کو ہے یہ مردہ دیرینہ قاش قاش

۱۔ ساقی نامہ (بال جبریل..... ۳۲۸) ۲۔ مغربی تہذیب (ضربِ کلیم..... ۴۴۲)

۳۔ یورپ اور یہود (ضربِ کلیم..... ۴۹۸)



مہربانی تہذیب

تہذیب کا کمال، شرافت کا ہے زوال  
 غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش  
 ہر گڑگ کو ہے بڑا معصوم کی تلاش  
 اے دوائے آبروئے کلیسا کا آئینہ  
 روم نے کر دیا سر بازار پاش پاش  
 پیر کلیسا! یہ حقیقت ہے دل خراش لے

کہاں فرشتہ تہذیب کی ضرورت ہے  
 نہیں زمانہ حاضر کو اس میں دشواری  
 جہاں قمار نہیں، زن تنگ لباس نہیں  
 جہاں حرام بتاتے ہیں فغللے خوری ۲

جوابات حق ہو، وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی  
 خدا نے مجھ کو دیا ہے دلِ خیر و بصیر  
 مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں  
 کنیزِ اہرمین و دوں نہاد و مردہ ضمیر  
 ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکی آزاد  
 فرگیوں کی سیاست ہے دبو بے زنجیر  
 متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی  
 تو ہیں ہراول لشکرِ کلیسا کے سفیر ۳

۲۔ انتداب (ضربِ کلیم..... ۵۰۸)

۱۔ ابی سینیا (ضربِ کلیم..... ۵۰۳)

۳۔ لادین سیاست (ضربِ کلیم..... ۵۰۹)

مہرِی تہذیب

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے  
ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار  
یہ پیر کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے  
بجلی کے چراغوں سے موز کیے افکار  
جتا ہے مگر شام و فلسطیں پہ مرا دل  
تدبیر سے کھلتا نہیں، یہ عقدہ دشوار  
ترکان ”جھاپیشہ“ کے پنچے سے نکل کر  
بے چارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار ۱

دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب و شرق  
میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو  
کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ  
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو ۲

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت  
ہے ایسی تجارت میں مسلمان کا خسارہ  
دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش  
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا  
اللہ کو پامردی مومن پہ بھروسا  
ایلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا ۳

۱۔ دام تہذیب (ضربِ کلیم..... ۵۱۰) ۲۔ ایلیس اپنے شیروں سے (ارمغانِ حجاز..... ۵۳۸)

۳۔ بڑے بلوچ کی نصیحت جینے کو (ارمغانِ حجاز..... ۵۴۲)





باب نمبر ۱۳

# اسلام کی نشاتِ ثانیہ





## اسلام کی نشاۃ ثانیہ

نشات کا مطلب ہے اُگنا، ظاہر ہونا، پیدا ہونا  
 نشاتِ ثانیہ کا مطلب ہے دوبارہ ظاہر ہونا، دوبارہ جی اٹھنا، دوبارہ عروج  
 اسلامی نشاتِ ثانیہ کا مطلب ہے اسلام کا دوبارہ عروج  
 موجودہ زوال اور پستی سے نکل کر دوبارہ وہی عروج حاصل کرنا جو ظہور  
 اسلام کے بعد ابتدائی چند صدیوں میں اسلام کو پوری دنیا میں حاصل تھا۔  
 ”تنظیمِ اسلامی“ کے بانی مہانی محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے ایک مضمون  
 ”اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل“ میں لکھا ہے: ”قرآن حکیم سے بھی یہ  
 ثابت ہوتا ہے اور رسول کریم کی احادیث میں تو صراحت کے ساتھ اس بات کی خبر  
 دی گئی ہے کہ قیامت سے قبل ایک بار پھر اللہ کا دین زمین پر اسی شان کے ساتھ  
 غالب ہو گا، جس شان سے اب سے چودہ سو سال قبل ہوا تھا، اور اس بار دینِ اسلام کا  
 غلبہ پورے کرۂ ارض کو محیط ہو گا اور پورا عالم انسانی توحید کے نور سے منور  
 ہو جائے گا۔ علامہ اقبال نے اس نور کی جھلک دکھاتے ہوئے فرمایا تھا۔

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آمینہ پوش  
 اور ظلمتِ رات کی سیماں پا ہو جائے گی  
 پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود  
 پھر جبینِ خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی  
 آنکھ جو کچھ دیکھ سکتی ہے لب پہ آسکتا نہیں  
 حویرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی  
 شبِ گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے  
 یہ چمنِ معمور ہو گا نغمۂ توحید سے



اسلام کی نشات ثانیہ

قرآن مجید میں تین بار یعنی سورہ توبہ کی آیت ۳۳، سورہ الفتح کی آیت ۲۸ اور سورہ الصف کی آیت ۹ میں یہ فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ

ترجمہ: وہی ہے اللہ، جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کرے اسے کل دین یا تمام ادیان (غدا ہب) پر۔

گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد و بعثت کا مقصد ”دین حق کا غلبہ“ ہے اور دوسری طرف مختلف اسلوبوں سے تین ہی بار یہ فرمایا کہ آنحضورؐ کی بعثت تمام نئی نوع انسانی کے لیے ہے، جیسے مثلاً سورہ سبا کی آیت ۲۸ میں فرمایا:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَلَمَةً بَشِيرًا وَنَذِيرًا

ترجمہ: ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو، مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر۔

گویا دین اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی خلافت عالمی، آفاقی اور پورے عالم انسانی اور کرۂ ارض کو محیط ہے۔ اس کی صریح پیش گوئیاں بھی صحیح احادیث میں موجود ہیں۔ چنانچہ مستند احمد بن حنبلؒ میں حضرت مقداد بن اسودؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (ترجمہ) روئے ارضی پر کوئی ایک گھر بھی ایسا نہیں بچے گا، خواہ وہ اینٹ لگا رہے کا بنا ہوا ہو، خواہ کنبلوں کے خیمے کی صورت میں ہو، جس میں اللہ کلمہ اسلام کو داخل نہ کر دے، خواہ کسی عزت والے کو اعزاز کے ساتھ، خواہ کسی پست بہت کے ضعف کے ذریعے (یعنی یا تو گھر والا خود ایمان لے آئے گا یا اسے اسلام کی بالا دستی قبول کرنی ہو گی) اس پر حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں کہا: ”تب تو وہی بات پوری ہو جائے گی کہ



— اسلام کی نشاۃ ثانیہ —

کل دین اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔ (اشارہ ہے سورۃ انفال کی آیت ۳۹ کی جانب)

محترم ڈاکٹر اسرار احمد قرآن و حدیث کے ان حوالوں کے ساتھ جب ”بر عظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل“ پر اظہار رائے کرتے ہیں تو اس بر عظیم میں نتیجہ علامہ اقبالؒ کے حق میں نکالتے ہیں۔ ”اب حالیہ تاریخ پر نظر ڈالیے تو صاف نظر آئے گا کہ بیسویں صدی عیسوی ”احیائے اسلام“ کی جدوجہد کی صدی ہے۔ چنانچہ اس کے آغاز کے ساتھ ہی وہ عمل بھی شروع ہو گیا تھا جسے اسلام اور امت مسلمہ کے ”ہمہ جہتی احیائے عمل“ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور جو اس صدی کے رابع اول کے خاتمے کے بعد تو پوری شدت اختیار کر گیا تھا..... تقریباً پون صدی پر پھیلی ہوئی اس تاریخ میں اہم ترین اور جامع ترین شخصیت علامہ اقبالؒ کی ہے۔ ان کے بارے میں جس قدر غور کیا جائے، حیرت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ان کی یہ ”جامعیت“ حیرت انگیز ہے کہ وہ واحد رہنما ہیں جو بہ یک وقت قوی اور احیائی دونوں محاذوں پر اس درجہ سرگرم عمل رہے کہ اگر ایک جانب وہ فکر اسلامی کے مجدد ہیں (”الہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید“ ان کے خطبات کا عنوان ہے) تو دوسری جانب تصور پاکستان کے خالق اور نظریہ پاکستان کے موجد بھی ہیں۔ اس طرح وہ داعی الی القرون بھی ہیں اور حکیم الامت بھی ہیں۔ جہاں تک قرآن کے فلسفہ و حکمت کے بحر عمیق میں غواصی کا تعلق ہے تو اس میدان میں تو وہ بالکل تنہا ہیں اور ان کا کوئی دوسرا اثر یک یا مثل ہے ہی نہیں۔“

جس طرح ڈیڑھ دو صدی قبل شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی دور رس نگاہ نے بقول اقبالؒ ”ہند میں سرمایہ ملت کی نگہبانی“ کے لیے احمد شاہ ابدالی کا انتخاب کیا تھا اور اسے ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی، صرف اسی طرح نہیں، بلکہ اس سے بھی کہیں آگے بڑھ کر حضرت علامہ اقبالؒ کی عقاب نگاہ نے ایک جانب لندن میں جا بسنے





اسلام کی نشاۃ ثانیہ

والے محمد علی جناح کو ”قومی ناخدا“ کی حیثیت سے معین کیا اور خود انھیں اس پہلو سے ”خود شناسی“ کا جوہر عطا کیا۔ اور دوسری جانب حیدر آباد کن میں مقیم ابو الاعلیٰ مودودیؒ کو ”متکلم اسلام“ ہونے کا اہل سمجھا اور انھیں اس خطے میں منتقل ہونے کی دعوت دی، جس کے بارے میں ان کی چشم باطن اور نگاہ دور بین دیکھ چکی تھی کہ وہاں ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام تقدیر الہی ہے (علامہ اقبالؒ کا خطبہ الہ آباد، ۱۹۳۰ء)

آج جب کہ پندرہویں صدی ہجری کا سورج طلوع ہوئے ۲۴ برس ہو چکے ہیں۔ ہمیں چاروں طرف تمام اسلامی ممالک میں ایک اضطراب اور زوال کی کیفیت دکھائی دے رہی ہے۔ کہیں پاکستان اور بھارت کے درمیان مسئلہ کشمیر ہے، کہیں مسلمانوں اور اسرائیل کے درمیان بیت المقدس کا مسئلہ ہے، کہیں چینچیا کے مسلمان، کہیں یورپ کے قلب میں بوسنیا کے مسلمان اپنے دین کی سرفرازی کے لیے سرزدھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکا کے ”ٹریڈ سینٹر“ کے انہدام کے بعد تو امریکی صدر بش نے صاف ہی کہہ دیا ہے ”صلیبی جنگ کا آغاز ہو چکا ہے۔“ یہ دوسری بات کہ اس نے سیاسی مصلحتوں کے تحت مسلمانانِ عالم سے معذرت کا اظہار کیا۔ امریکا کے ایک بڑے عیسائی پادری نے حال ہی میں بیان دیا ہے کہ ”پیغمبر اسلام دہشت گرد تھے“ (نعوذ باللہ)۔ مسلمانانِ عالم کے زوال کی نشانی اس سے بڑی کیا ہو سکتی ہے کہ ایسے شرمناک بیانات پر بھی عالم اسلام اور ان کی اجتماعی تنظیم ”اسلامی سربراہ کانفرنس“ (او آئی سی) ایک معمولی قرارداد بھی منظور نہ کر سکی۔ یہ کوئی علاقائی اور اقتصادی جنگ نہیں، بلکہ ایک نظریاتی، مذہبی جنگ ہے۔ افغانستان میں روس کی جارحیت اور اس کے بعد امریکا کی شدید جارحیت، عراق پر امریکی جارحیت اور اس کے بعد پورے عالم اسلام کے لیے مغرب



## اسلام کی نشاۃ ثانیہ

کا جارحانہ چیلنج، اور مسلمان ملکوں کی بے بسی اور بے چارگی علامہ اقبال ایسے مجہد کو آواز دے رہی ہے۔

عصر حاضر میں ملتِ اسلامیہ کے درمیان اضطراب و اجتہاد کی تحریک کے محرک مفکر اسلام علامہ اقبالؒ ہیں جن کی دور رس نگاہ نے آنے والے دور یعنی عصرِ رواں کی عکاسی، ایک پیش گوئی کی صورت میں ”جواب شکوہ“ میں پہلے ہی سے کر دی تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ ایک روز عالم اسلام کا چن خونِ شہدا کی لالی سے گل زار بن جائے گا اور جب بہار آئے گی تو گلستانِ اسلام ہر قسم کے خس و خاشاک سے خالی ہو جائے گا اور یہ پیش گوئی اس وقت صحیح ثابت ہو گی جبکہ عالم اسلام کے آسمان کا رنگ عنابی ہو گا۔ اسلامی ممالک کی موجودہ زبوں حالی کا نقشہ علامہ نے اپنی نظم ”بلادِ اسلامیہ“ میں یوں پیش کیا ہے:

سرزمینِ دلی کی مسجدِ دلِ غم دیدہ ہے  
 ذرے ذرے میں لہوِ اسلاف کا خوابیدہ ہے  
 پاک اس اجڑے گلستاں کی نہ ہو کیوں کر زمیں  
 خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں  
 سوتے ہیں اس خاک میں خیر الامم کے تاجدار  
 نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار  
 دل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیِ محفل کی یاد  
 جل چکا حاصل مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد  
 ہے زیارت گاہِ مسلم گو جہاں آباد بھی  
 اس کرامت کا مگر حق دار ہے بغداد بھی  
 یہ چن وہ ہے کہ تھا جس کے لیے سامانِ ناز  
 لالہ صحرا جسے کہتے ہیں تہذیبِ حجاز

— اسلام کی نشاناتِ ثانیہ —

خاک اس بستی کی ہو کیوں کر نہ ہمدوشِ ارم  
جس نے دیکھے جانشینانِ پیبرؐ کے قدم  
جس کے غنچے تھے چمنِ ساماں وہ گلشن ہے یہی  
کانپتا تھا جن سے روماء، ان کا مدفن ہے یہی

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور  
ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور  
بجھ کے بزمِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی  
اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی

قبر اس تہذیب کی یہ سرزمینِ پاک ہے  
جس سے تاکِ گلشنِ یورپ کی رگِ نمناک ہے

نطۃ قسطنطنیہ، یعنی قیصر کا دیار  
مہدی امت کی سطوت کا نشانِ پایدار  
صورتِ خاکِ حرم یہ سرزمین بھی پاک ہے  
آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے  
نکبتِ گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا  
ترتیبِ ایوب انصاریؓ سے آتی ہے صدا

اے مسلمانِ ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر  
سیکڑوں صدیوں کی کشتِ و خون کا حاصل ہے یہ شہر

وہ زمیں ہے تو، مگر اے خوابِ گاہِ مصطفیٰؐ  
دید ہے کعبے کو تیری حجِ اکبر سے سوا  
خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ تکلیں  
اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں



— اسلام کی نشاۃ ثانیہ —

تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی  
جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی  
نام لیوا جس کے شاہنشاہِ عالم کے ہوئے  
جانشینِ قیصر کے، وارثِ مسندِ جم کے ہوئے  
ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام  
ہند ہی بنیاد ہے اس کہ نہ فارس ہے نہ شام  
آہ! یثرب! دیں ہے مسلم کا تو مادی ہے تو  
نقطۂ جاذبِ تاثر کی شعاعوں کا ہے تو  
جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں  
صبح ہے تو اس چمن میں گوہرِ شبنم بھی ہیں

علامہ اقبالؒ نے جون ۱۹۱۲ء میں ایک نظم ”مسلم“ کے عنوان سے تخلیق کی تھی، جس میں انھوں نے مسلمانانِ عالم کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

ہم نشیں! مسلم ہوں میں، توحید کا حامل ہوں میں  
اس صداقت پر ازل سے شہدِ عادل ہوں میں  
نبضِ موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے  
اور مسلم کے تنخیل میں جسارت اس سے ہے  
حق نے عالم اس صداقت کے لیے پیدا کیا  
اور مجھے اس کی حفاظت کے لیے پیدا کیا  
دہر میں غارت گرِ باطل پرستی، میں ہوا  
حق تو یہ ہے، حافظِ ناموس ہستی، میں ہوا  
میری ہستی پیرِ ہن، عریانیِ عالم کی ہے  
میرے مٹ جانے سے رسوائی، بنی آدم کی ہے



..... اسلام کی نشاۃ ثانیہ .....

قسمتِ عالم کا مسلم، کوکبِ تابندہ ہے  
جس کی تابانی سے افسوں سحرِ شرمندہ ہے  
آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرارِ حیات  
کہہ نہیں سکتے مجھے نویدِ پیکارِ حیات  
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے  
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے  
پاس کے غصہ سے ہے آزاد میرا روزگار  
فتحِ کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار  
ہاں یہ سچ ہے، چشمِ بر عہدِ کہن رہتا ہوں میں  
اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں  
یادِ عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے  
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے  
سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں  
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

اپنی ایک نظم جس کا عنوان ”حضورِ رسالت مآبؐ میں“ ہے، میں اقبال سرورِ کائنات، محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی حاضری کو یوں بیان کرتے ہیں:

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامہٗ زمانہ ہوا  
جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا  
قیودِ شام و سحر میں بسر تو کی لیکن  
نظامِ کہنہٗ عالم سے آشنا نہ ہوا



اسلام کی نشاۃ ثانیہ

فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے تجکو  
حضور آیہِ رحمت میں لے گئے تجکو  
کہا حضورؐ نے اے عندلیبِ باغِ حجاز!  
کلی کلی ہے تری گرمیِ نوا سے گداز  
ہمیشہ سرخوشِ جامِ ولا ہے دل تیرا  
فداگی ہے تری غیرتِ جہودِ نیاز  
اڑا جو ہستی دنیا سے تو سوئے گردوں  
سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعتِ پرواز  
نکل کے باغِ جہاں سے برگِ بو آیا  
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟  
”حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی  
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی  
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں  
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی  
مگر میں نذر کو اک آگینہ لایا ہوں  
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی  
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں  
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں“

اقبال حضورِ رسالتؐ مآب کی خدمتِ اقدس میں نذرانے کے طور پر ایک  
آگینہ پیش کرتے ہیں، جس میں ایک ایسی چیز ہے جو جنت میں بھی نہیں ملتی اور جس  
سے امتِ مسلمہ کی آبرو جھلکتی ہے، یعنی طرابلس کے شہیدوں کا لہو۔ طرابلس تو ایک



### اسلام کی نشانات ثانیہ

علامت ہے، ورنہ اقبالؒ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دنیا بھر میں جہاں کہیں اللہ کی راہ میں مسلمان شہادت گاہ الفت میں اپنا لو بھاتے ہیں، وہ آنحضورؐ کی خدمت میں نذرانہ عقیدت کی حیثیت رکھتا ہے۔

خود اللہ تعالیٰ نے (اقبال ہی کی زبان سے سہی) ”جواب شکوہ“ والی نظم میں مسلمانوں کو بیدار ہونے کی تلقین کی ہے اور اقوامِ عالم میں مسلمانوں کو جو فضیلت حاصل ہے، اس کی یاد دلائی ہے۔ ”جواب شکوہ“ ایک طویل نظم ہے، اس کے چند آخری بند یہ ہیں۔ ان اشعار میں عصرِ حاضر کی آفتوں اور سختیوں کے باوجود دیگر اقوامِ عالم پر مسلمانوں کی برتری کا اظہار کرتے ہیں:

عہدِ نو برق ہے، آتشِ زنِ ہر خرمن ہے  
ایمن اس سے کوئی صحرا نہ کوئی گلشن ہے  
اس نئی آگ کا اقوامِ کہن ایندھن ہے  
ملتِ ختمِ رسل شعلہ بہ پیراہن ہے

آج بھی ہو جو براہیم کا ایمان پیدا  
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی  
کو کب غنچے سے شاخیں ہیں چمکنے والی  
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی  
گل بر انداز ہے خونِ شہدا کی لالی

رنگِ گردوں کا ذرا دیکھ تو عتابی ہے  
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افقِ تابی ہے

امتیں گلشنِ ہستی میں شمر چیدہ بھی ہیں  
اور محرومِ شمر بھی ہیں، خزاں دیدہ بھی ہیں



اسلام کی نشاۃ ثانیہ

سیکڑوں نخل ہیں، کاہیدہ بھی، بالیدہ بھی ہیں  
سیکڑوں بطنِ چمن میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں  
نخلِ اسلام نمونہ ہے برومندی کا  
پھل ہے یہ سیکڑوں صدیوں کا چمن بندی کا

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا  
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کتعاں تیرا  
قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی : یاں تیرا  
غیر یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا  
نخلِ شمع استی و درشعلہ دودریشہ تو  
عاقبت سوز بود سایہ اندیشہ تو

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے  
نقشہ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے  
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے  
پاساں مل گئے کعبے کو ضم خانے سے  
کشتی حق کا زمانے میں سہارا تو ہے  
عصرِ نورات ہے، دھندلا سا ستارا تو ہے

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا  
غافلوں کے لیے پیغام ہے بیداری کا  
تو سمجھتا ہے، یہ ساماں ہے دل آزاری کا  
امتحان ہے ترے ایثار کا، خودداری کا  
کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے  
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے





اسلام کی نشاۃ ثانیہ

پشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری  
ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری  
زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری  
کو کب قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے

نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

مثلِ بو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا

رختِ بردوش ہوئے چمنستاں ہو جا

ہے تنگ مایہ، تو ڈرے سے بیاباں ہو جا

نغمہٗ موج سے ہنگامہٗ طوفاں ہو جا

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے

دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

ہو نہ یہ پھول، تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو

چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو

یہ نہ ساقی ہو تو پھر سے بھی نہ ہو، خم بھی نہ ہو

بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو

خیمہٗ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے

نبضِ ہستی تپشِ آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں، دامنِ کہسار میں، میدان میں ہے

بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے

چین کے شہر، مراقش کے بیابان میں ہے

اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے



اسلام کی نشانات ثانیہ

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے

رفعتِ شانِ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ دیکھے

مردمِ چشمِ زمیں ، یعنی وہ کالی دنیا

وہ تمھارے شہدا پالنے والی دنیا

گرمی مہر کی پروردہ ہلالی دنیا

عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا

تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح

غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے ششیر تری

مرے درویش خلافت ہے جہاں گیر تری

ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری

تو مسلمان ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

پھر اقبالؒ تمام نوجوانانِ ملت کے عالم گیر ترانے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ کا

ش اس ترانے کا منظوم ترجمہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں اور بالخصوص اسلامی ملکوں

کی قومی زبانوں میں ہو جائے۔

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا

مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارا

آساں نہیں مٹانا، نام و نشان ہمارا



اسلام کی نشاۃ ثانیہ

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا  
ہم اس کے پاساں ہیں، وہ پاساں ہمارا  
تیغوں کے سائے میں ہم، پل کر جواں ہوئے ہیں  
خنجر ہلال کا ہے، قومی نشاں ہمارا  
مغرب کی وادیوں میں گوئچی ازاں ہماری  
تھمتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا  
باطل سے دبے والے اے آسماں نہیں ہم  
سو بار کرچکا ہے تو امتحاں ہمارا  
اے گلستانِ اندلس! وہ دن ہیں یاد تجکو  
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا  
اے موجِ دجلہ! تو بھی پہچانتی ہے ہم کو  
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا  
اے ارضِ پاک! تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم  
ہے خوں تیری رگوں میں اب تک رواں ہمارا  
سالارِ کارواں ہے میرِ حجازِ اپنا  
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا  
اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا  
ہوتا ہے جادہ پیلا، پھر کارواں ہمارا

جب ملتِ اسلامیہ کا کارواں پھر سے جادہ پیلا ہونے لگتا ہے، تو دنیا کے تمام  
نوجوانانِ اسلام ہاتھ اٹھا کر، اللہ تعالیٰ کے حضور مجسم دعا بن جاتے ہیں:



— اسلام کی نشاۃ ثانیہ —

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے  
جو قلب کو گرما دے، جو روح کو تڑپا دے  
پھر وادیِ فاراں کے ہر ذرے کو چمکا دے  
پھر شوقِ تماشا دے پھر ذوقِ تقاضا دے  
محرورِ تماشا کو پھر دیدہٴ بینا دے  
دیکھا ہے جو کچھ میں نے، اوروں کو بھی دکھلا دے  
بھٹکے ہوئے آہو کو، پھر سوئے حرم لے چل  
اس شہر کے خوگر کو، پھر وسعتِ صحرا دے  
پیدا دلِ ویراں میں، پھر شورشِ محشر کر  
اس محملِ خالی کو، پھر شاہدِ لیلا دے  
اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو  
وہ داغِ محبت دے، جو چاند کو شرما دے  
رفعت میں مقاصد کو ہم دوشِ ثریا کر  
خود داریِ ساحل دے، آزادیِ دریا دے  
بے لوثِ محبت ہو، بے باکِ صداقت ہو  
سینوں میں اجالا کر، دلِ صورتِ مینا دے  
احساسِ عنایت کر آثارِ مصیبت کا  
امروز کی شورش میں اندیشہٴ فردا دے  
میں بلبلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا  
تاثیرِ کاساحل ہوں، محتاجِ کو داتا دے

نوجوانوں کا قافلہٴ ہمت و جرأت سے جب قدم بڑھتا ہے تو اقبالؒ ان سے

یوں مخاطب ہوتے ہیں:



----- اسلام کی نشاۃ ثانیہ -----

جہاں اگر چہ دگرگوں ہے، قم باذن اللہ  
وہی زمیں، وہی گردوں ہے، قم باذن اللہ  
کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے  
تری رگوں میں وہی خوں ہے، قم باذن اللہ  
فرنگیوں کا یہ انسوں ہے، قم باذن اللہ

اس دور میں سے اور ہے، جام اور ہے جم اور  
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور  
مسلم نے بھی تعمیر کیا، اپنا حرم اور  
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے  
جو پیر ہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ ترا شیدۂ تہذیب نوی ہے  
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویٰ ہے  
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے  
اسلام ترا دیں ہے تو مصطفویٰ ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے  
اے مصطفویٰ، خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی  
رہ بحر میں آزادِ وطن، صورتِ مابہی  
ہے ترکِ وطن، سنتِ محبوبِ الہی  
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی



----- اسلام کی نشاۃ ثانیہ -----

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے  
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے۔

کیا سنا تا ہے مجھ کو ترک و عرب کی داستاں  
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں، اسلامیوں کا سوز و ساز  
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ ظلیل\*  
حُشِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز  
ہو گئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ  
جو سراپا ناز تھے، ہیں آج مجبورِ نیاز  
لے رہا ہے مے فردشانِ فرنگستاں سے پارس  
وہمے سرکش، حرارت جس کی ہے مینا گداز  
حکمتِ مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی  
کلکے کلکے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز  
ہو گیا مانندِ آبِ ارزاں مسلمان کا لبو  
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں، دانائے راز  
رہب و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات  
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر  
پھر سیاست چھوڑ کر داخلِ حصارِ دیں میں ہو  
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک شمر  
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے  
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

اسلام کی نشاۃ ثانیہ

جو کرے گا امتیاز رنگ و بو مٹ جائے گا  
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گھر!  
نسل اگر مسلم کی، مذہب پر مقدم ہو گئی  
اڑ گیا دنیا میں تو دنیا میں مانند خاک رہ گزر  
تا خلافت کی بناء دنیا میں ہو پھر استوار  
لا کہیں سے ڈھونڈ کر، اسلام کا قلب و جگر

دلیل صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابلی  
افق سے آفتاب ابھرا، گیا دور گراں خوابلی  
عروقی مردہ مشرق میں خون زندگی دوڑا  
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی  
مسلمان کو مسلمان کر دیا طوفان مغرب نے  
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی  
عظا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے  
شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی  
اثر کچھ خواب کا غیظوں میں باقی ہے تو اے بلبل  
”تو را تلخ تری زن چو ذوق نغمہ کم یابی“  
سرشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا  
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گھر پیدا  
کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے  
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

۱۔ حضر راہ (بانگ درا) ..... ۲۰۸



----- اسلام کی نشانات ثانیہ -----

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے  
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا  
جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی  
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا  
ہزاروں سالِ ز گس اپنی بے نوری پہ روتی ہے  
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ وَر پیدا  
ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے  
مسماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے ۱

.....

روحِ اسلام کی ہے نورِ خودی، نارِ خودی  
زندگانی کے لیے نارِ خودی نور و حضور  
یہی ہر چیز کی تقویم، یہی اصلِ نمود  
گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا ہے مستور  
لفظِ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر  
دوسرا نام اسی دین کا ہے ”فقرِ غیور“ ۲

.....

ہے زندہ لفظ وحدتِ افکار سے ملت  
وحدت ہو فتا جس سے وہ الہام بھی الحاد  
وحدت کی حفاظت نہیں، بے قوتِ بازو  
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خدا داد

۱۔ طلوعِ اسلام (بانگِ درا..... ۲۱۱)

۲۔ اسلام (ضربِ کلیم..... ۴۰۸)



----- اسلام کی نشانات ثانیہ -----

اے مردِ خدا تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل  
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد  
مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید  
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد  
ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت  
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

بتاؤں تجھ کو مسلمان کی زندگی کیا ہے  
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمال جنوں  
طلوع ہے صفتِ آفتاب اس کا غروب  
یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناگوں  
نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بے زاری  
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں  
حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی  
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطون  
عناصر اس کے ہیں، روح القدس کا ذوقِ جمال  
عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں

میں نہ عارف، نہ مجذد، نہ محدث، نہ فقیہ  
مجھ کو معلوم نہیں، کیا ہے نبوت کا مقام

۲۔ ہندی اسلام (ضربِ کلیم ..... ۴۱۲)

۲۔ مدنیّت اسلام (ضربِ کلیم ..... ۴۲۳)



### اسلام کی نشاۃ ثانیہ

ہاں مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر  
 فاش ہے مجھ پر ضمیر فلکِ نیلی فام  
 عصرِ حاضر کی شبِ تاری میں دیکھی میں نے  
 یہ حقیقت کہ ہے روشن صفتِ ماہِ تمام  
 ”وہ نبوتِ مسلمان کے لیے برگِ حشیش  
 جس نبوت میں نہیں، قوت و شوکت کا پیام“ ۱

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام  
 پوشیدہ نگاہوں سے رہی، وحدتِ آدم  
 تفریقِ مل، حکمتِ افریقہ کا مقصود  
 اسلام کا مقصود، فقط ملتِ آدم  
 مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام  
 جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟ ۲

ضمیر اس مدنیت کا دیں سے ہے خالی  
 فرگیوں میں اخوت کا ہے نسب پہ قیام  
 بلند تر نہیں انگریز کی نگاہوں میں  
 قبولِ دین مسیحی سے برہمن کا مقام

۱۔ نبوت (ضربِ کلیم.....۴۳۰)

۲۔ مکہ اور جنیوا (ضربِ کلیم.....۴۳۱)

— اسلام کی نشاۃ ثانیہ —

اگر قبول کرے دین مصطفیٰ انگریز!  
سیاہ روز مسلمان رہے گا پھر بھی غلام لے

پانی بھی مسخر ہے ، ہوا بھی ہے مسخر  
کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے  
دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب  
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے  
طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جیوا  
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے ۲

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف  
ہو نہ جائے آشکارا، شرع پیغمبر کہیں  
الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر  
حافظِ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں  
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے  
نے کوئی فغفور و خاقان، نے تقیر رہ نشیں  
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک، صاف  
معصوم کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

۱۔ اشاعتِ اسلام فرنگستان میں (ضربِ کلیم..... ۳۳۵)

۲۔ جمعیتِ اقوامِ مشرق (ضربِ کلیم..... ۵۰۳)



----- اسلام کی نشاۃ ثانیہ -----

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب  
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں  
ہم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب  
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں  
ہے یہی بہتر، الہیات میں الجھا رہے  
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے!



۱۔ ابلیس اپنے مشیروں سے (ضرب کلیم..... ۵۳۹)





باب نمبر ۱۵

# دخترانِ ملت کے نام





..... دخترانِ ملت کے نام .....

دخترانِ ملت کے لیے اقبال وہی طرزِ حیات پسند کرتے ہیں، جو قرونِ اولیٰ میں مسلمان خواتین میں پایا جاتا تھا۔ جب عورتیں مروجہ برقع کے نہ ہوتے ہوئے بھی شرم و حیا اور احساسِ عفت و عصمت میں مثالی نمونہ تھیں اور شرعی پردے کے اہتمام کے ساتھ ساتھ زندگی کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھیں۔

اقبالؒ کو ان شاعروں اور فن کاروں سے شکایت تھی جو عورت کے نام کا غلط استعمال کر کے ادب کی پاکیزگی، بلندی اور مقصدیت کو صدمہ پہنچاتے ہیں۔ وہ اپنی ایک نظم میں کہتے ہیں۔

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند  
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ، بدن کو بیدار  
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس  
آہ بے چاروں کے اعصاب پر عورت ہے سوار

اقبالؒ دنیا کی سرگرمیوں کی اصل ”ماؤں“ کی ذات کو قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی ذات امین ممکنات ہے اور انقلاب انگیز مضمرات کی حامل اور جو قومیں ماؤں کی قدر نہیں کرتیں، ان کا نظامِ زندگی سنبھل نہیں سکتا۔

وہ آزادی نسوان کی تحریک کے اس لیے حامی نہیں کہ اس کا نتیجہ دوسرے انداز میں عورتوں کی غلامی ہے۔ اس سے خواتین کی مشکلات آسان نہیں، مزید پیچیدہ ہو جائیں گی اور انسانیت کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ جذبہٴ امومت ختم ہو جائے گا، ماں کی مامتا کی روایت کمزور پڑ جائے گی۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ جس علم سے عورت اپنی فطری خصوصیت کھو دیتی ہے، وہ علم نہیں، بلکہ موت ہے اور مغربی تہذیب اقوامِ عالم کو اسی موت کی دعوت دے رہی ہے۔





— دخترانِ ملت کے نام —

علامہ اقبالؒ حضرت فاطمہ زہراؑ کو ملتِ اسلامیہ کی خواتین کے لیے ”مثالی خاتون“ سمجھتے ہیں اور جگہ جگہ ان کے اتباع کی تاکید کرتے ہیں، کہ وہ کس طرح پکی پیٹے ہوئے بھی قرآن مجید پڑھتی تھیں اور گھریلو کاموں میں مشکیزہ تک اٹھانے پر صبر فرماتی تھیں۔ اقبالؒ کے خیال میں سیرت کی اسی پہنچگی سے حضراتِ حسینؑ ان کی آغوش سے نکلے۔

مزرع تسلیم را حاصل بتولؑ  
مادراں را اسوۂ کامل بتولؑ  
آں ادب پروردہ صبر و رضا  
آسیا گرداں و لب قرآں سرا  
فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند  
چشم ہوش از اسوۂ زہراؑ بلند  
تا حسینؑ شاخ تو بار آورد  
موسم پیشیں بہ گلزار آورد  
اگر پندے زردویشے پذیری  
ہزار امت بمیری تو نہ سیری  
بتولؑ باش و پنہاں شو ازیں عصر  
کہ در آغوش شیرے گیری!

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی  
ڈھونڈی قوم نے فلاح کی راہ  
روشِ مغربی ہے مدِ نظر  
وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ



— دخترانِ ملت کے نام —

یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین؟  
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ ل

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا  
مگر یہ مسئلہ زن رہا ، وہیں کے وہیں  
تصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں  
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں  
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور  
کہ مردِ سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں ۲

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے  
ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش!  
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال  
مرد بیکار و زن تہی آغوش ۳

بہت رنگ بدلے سہر بریں نے  
خدایا یہ دنیا جہاں تھی وہیں ہے

۱۔ نظریات (بانکِ درا.....۲۲۲)

۲۔ مردِ فرنگ (ضربِ کلیم.....۲۵۸)

۳۔ ایک سوال (ضربِ کلیم.....۲۵۸)

----- دخترانِ ملت کے نام -----

تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں میں نے  
وہ خلوت نشیں ہے، یہ خلوت نشیں ہے  
ابھی تک ہے پردے میں اولادِ آدم  
کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے! لے

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے  
روشن ہے نگہِ آئینہٴ دل ہے مکدر  
بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے  
ہو جاتے ہیں افکارِ پراگندہ و اتر  
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے  
وہ قطرہٴ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر  
خلوت میں خودی ہوتی ہے خود گیر، لیکن  
خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسر ہے

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ  
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں  
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشبِ خاک اس کی  
کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُہِ مکنوں

۱۔ پردہ (ضربِ کلیم.....۴۵۹)

۲۔ خلوت (ضربِ کلیم.....۴۵۹)



..... دخترانِ ملت کے نام .....  
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن  
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں ۱

.....  
اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا  
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے، وہ قد  
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتب  
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں، تہذیب کے فرزند  
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش  
مجبور ہیں، معذور ہیں، مردانِ خرد مند  
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ؟  
آزادی نسواں کے زمرد کا گلوبند؟ ۲

.....  
اک زندہ حقیقت مرے سینے میں ہے مستور  
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد  
نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی  
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد  
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا  
اس قوم کا خورشید، بہت جلد ہوا زرد ۳

۱۔ عورت (ضربِ کلیم..... ۳۶۰)

۲۔ آزادیِ نسواں (ضربِ کلیم..... ۳۶۰)

۳۔ عورت کی حفاظت (ضربِ کلیم..... ۳۶۱)



————— دخترانِ ملت کے نام —————

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ اُمومت  
ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمرِ موت  
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن  
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظرِ موت  
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسہ زن  
ہے عشق و محبت کے لیے علمِ دہنِ موت ۱

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے ، بے منتِ غیر  
غیر کے ہاتھ میں ہے، جوہرِ عورت کی نمود  
راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نکتہٴ شوق  
آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود  
کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات  
گرم اسی آگ سے ہے ، معرکہٴ بود و نبود  
میں بھی مظلومی نسواں سے ہوں غمِ ناک بہت  
نہیں ممکن مگر اس عقدہٴ مشکل کی کشود ۲

۱۔ عورت اور تعلیم (ضربِ کلیم.....۴۶۱)

۲۔ عورت۔ (ضربِ کلیم.....۴۶۲)





باب نمبر ۱۶

# نوناہالا ان ملت کے نام





نئی نسل یا نژادوں سے اقبال کے گھرے تعلق کا اندازہ ان نظموں سے بھی کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے بچوں کے لیے کہی ہیں۔ یہ نظمیں گویا اس عظیم پیغام کی تہید ہیں جو اقبالؒ نئی نسل کو دینا چاہتے تھے، اس لیے کہ ان میں نئی نسل کی سیرت و کردار سازی کے لیے قریب قریب وہی روش اختیار کی گئی ہے جس پر چل کر کوئی شخص اپنی خودی کو استوار و مستحکم بنا سکتا ہے۔ ”ایک مکڑا اور مکھی“ کے عنوان کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ خوشامد میں آنا گویا جان سے ہاتھ دھوٹا ہے۔ ”پہاڑ اور گلہری“ میں یہ بات بچوں کے ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ حقیقی بڑائی کا تعلق قد و قامت سے نہیں، بلکہ حرکت و عمل سے ہے۔ ”ایک گائے اور بکری“ والی نظم میں اس بات کا اشارہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اس کا وجود ساری مخلوق کے لیے باعثِ رحمت ہے۔

”بچے کی دعا“، تعمیر سیرت کے سلسلے میں ایک لاثانی دعا ہے۔ چھوٹے بڑے، عورت مرد، بوڑھے جوان سب کو زبانی یاد ہے اور اس کا اثر سب کے دلوں پر نقش ہے۔ ہمدردی والی نظم صرف یہی نہیں کہ ہمدردی کا درس دیتی ہے بلکہ ظلمت کو روشنی اور بدی کو نیکی میں بدل دینے کا عزم و حوصلہ بخشتی ہے۔

اقبالؒ نے ان نظموں میں بڑا سادہ اور سلیس طرزِ تحاطب اختیار کیا ہے۔ بچوں کی نصیحت آموزی کے لیے چھوٹی چھوٹی دل چسپ کہانیوں کو آسان اور خوب صورت نظموں میں پیش کیا گیا۔ بچوں کو اخلاقی تعلیم دینے کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے لیے اقبالؒ کی یہ چند نظمیں بہت مقبول ہوئی ہیں:-





نومحالدین ملت ہے نام

## ایک کڑا اور کبھی

ایک دن کسی کبھی سے یہ کہنے لگا کڑا  
لیکن مری کنیا کی نہ جاگی کبھی قسمت  
غیروں سے نہ ملیے تو کوئی بات نہیں ہے  
آؤ جو مرے گھر تو عزت ہے یہ میری  
ملکھی نے سنی بات جو کڑے کی تو بولی  
اس جال میں کبھی کبھی آنے کی نہیں ہے  
جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا، پھر نہیں اترتا

کڑے نے کہا: واہ! فرجی مجھے سمجھے  
منظور تمھاری مجھے خاطر تھی، وگرنہ  
اُڑتی ہوئی آئی ہو خدا جانے کہاں سے  
اس گھر میں کئی تم کو دکھانے کی ہیں چیزیں  
لگے ہوئے دروازوں پہ باریک ہیں پردے  
مہمانوں کے آرام کو حاضر ہیں بچھونے  
ملکھی نے کہا: خیر! یہ سب ٹھیک ہے لیکن  
ان نرم بچھونوں سے خدا مجھ کو بچائے

سو جائے کوئی ان پہ تو پھر اٹھ نہیں سکتا

کڑے نے کہا دل میں، سنی بات جو اس کی  
سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں  
یہ سوچ کے ملکھی سے کہا اس نے بڑی بی  
ہوتی ہے اسے آپ کی صورت سے محبت  
آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں  
چھائوں اسے کس طرح یہ کمبخت ہے دانا  
دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے ہندا  
اللہ نے بخشا ہے بڑا آپ کو رُتبا  
ہو جس نے کبھی ایک نظر آپ کو دیکھا  
سر آپ کا اللہ نے کلفی سے سجایا



— نوحہ دار، ملت کے نام —

یہ حسن، یہ پوشاک، یہ خوبی، یہ صفائی! بھراس پہ قیامت ہے یہ اڑتے ہوئے گانا  
کبھی نے سنی جب یہ خوشامد تو بستی بولی کہ نہیں آپ سے جھوکوئی کھکا  
انکار کی عادت کو بجھتی ہوں بُرا میں سچ یہ ہے کہ دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا  
یہ بات کہی اور اُڑی اپنی جگہ سے پاس آئی تو کڑے نے اُچھل کر اسے پکڑا  
بھوکا تھا کئی روز سے اب ہاتھ جو آئی  
آرام سے گھر بیٹھ کے کبھی کو اُڑایا

## ایک پہاڑ اور گلہری

(ماخوذ از ایرسن)

بچوں کے لیے

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے تجھے ہوشرم، تو پانی میں جا کے ڈوب مرے  
ذرا سی چیز ہے، اس پر غرور! کیا کہنا یہ عقل اور یہ سمجھ، یہ شعور! کیا کہنا!  
خدا کی شان ہے ناجیز، چیز بن بیٹھیں جو بے شعور ہوں یوں باتیز بن بیٹھیں  
تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے زمیں پست ہے مری آن بان کے آگے  
جو بات مجھ میں ہے تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں

بھلا پہاڑ کہاں! جانور غریب کہاں

کہا یہ سُن کے گلہری نے، منہ سنبھال ذرا یہ کچی باتیں ہیں دل سے انہیں نکال ذرا  
جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا نہیں ہے تو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا  
ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے کوئی بڑا، کوئی چھوٹا، یہ اس کی حکمت ہے  
بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اس نے مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اس نے  
قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں بڑی بڑائی ہے! خوبی ہے اور کیا تجھ میں؟  
جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

نہیں ہے چیز کٹی کوئی زمانے میں

کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں



نومحالف ملت کے نام

## ایک گائے اور بکری

(ماخوذ)

اک چراگاہ ہری بھری تھی کہیں  
کیا سماں اس بہار کا ہو بیاں  
تھے اناروں کے بے شمار درخت  
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں  
کسی ندی کے پاس اک بکری  
جب ٹھہر کر ادھر ادھر دیکھا  
پہلے جھک کر اسے سلام کیا  
کیوں بڑی بی! مزاج کیسے ہیں!  
کٹ رہی ہے بُری بھلی اپنی  
جان پر آہنی ہے، کیا کہیے  
دیکھتی ہوں خدا کی شان کو میں  
زور چلتا نہیں غریبوں کا  
آدمی سے کوئی بھلا نہ کرے  
دودھ کم دوں تو بُبُوڑاتا ہے  
جھکنڈوں سے غلام کرتا ہے  
اس کے بچوں کو پالتی ہوں میں  
بدلے نیکی کے یہ برائی ہے  
سن کے بکری یہ ماجرا سارا  
بات سچی ہے بے مزا لگتی  
یہ چراگاہ، یہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا  
ایسی خوشیاں ہمیں نصیب کہاں

تھی سراپا بہار جس کی زمیں  
ہر طرف صاف ندیاں تھیں رواں  
اور پتیل کے سایہ دار درخت  
طائروں کی صدائیں آتی تھیں  
چرتے چرتے کہیں سے آنکلی  
پاس اک گائے کو کھڑے پایا  
پھر سلیقے سے یوں کلام کیا  
گائے بولی کہ خیر اچھے ہیں  
ہے مصیبت میں زندگی اپنی  
اپنی قسمت بُری ہے، کیا کہیے  
رو رہی ہوں بڑوں کی جان کو میں  
پیش آیا لکھا نصیبوں کا  
اس سے پالا پڑے، خدا نہ کرے  
ہوں جو ڈبلی تو بیچ کھاتا ہے  
کن فریبوں سے رام کرتا ہے  
دودھ سے جان ڈالتی ہوں میں  
میرے اللہ! تری دہائی ہے  
بولی، ایسا گلہ نہیں اچھا  
میں کہوں گی مگر خدا لگتی  
یہ ہری گھاس اور یہ سایا  
یہ کہاں، بے زباں غریب کہاں



— نو بھالین ملت کے نام —

یہ مزے آدمی کے دم سے ہیں      لطف سارے اسی کے دم سے ہیں  
اس کے دم سے ہے اپنی آبادی      قید ہم کو بھلی ، کہ آزادی؟  
سو طرح کا بنوں میں ہے کھکا      واں کی گزران سے بچائے خدا  
ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا      ہم کو زیبا نہیں گلہ اس کا  
قدر آرام کی اگر سمجھو      آدمی کا کبھی گلہ نہ کرو  
گائے سن کر یہ بات شرمائی      آدمی کے گلے سے پیچھتائی  
دل میں پرکھا بھلا بُرا اس نے      اور کچھ سوچ کر کہا اس نے  
یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی  
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

بانگ درا

## بچے کی دعا

(ماخوذ)

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری      زندگی شمع کی صورت ہو ضایا میری  
دُور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے      ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے  
ہو مرے دم سے یوں ہی میرے وطن کی زینت  
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت  
زندگی ہو مری پروانے کی صورت یا رب      علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب  
ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا      درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا  
مرے اللہ بُرائی سے بچانا مجھ کو  
نیک جو راہ ہو اس راہ پہ چلانا مجھ کو



— نو معالین ملت کے نام —

## ہمدردی (ماخوذ از ولیم کوپر)

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا      بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا  
 کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی      اڑنے چگنے میں دن گزارا  
 پہنچوں کس طرح آشیاں تک      ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا  
 سن کر بلبل کی آہ و زاری      جھنو کوئی پاس ہی سے بولا  
 حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے      کیزا ہوں اگرچہ میں ذرا سا  
 کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری      میں راہ میں روشنی کروں گا  
 اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل      چمکا کے مجھے دیا بنایا  
 ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے      آتے ہیں جو کام دوسروں کے

بانگ درا





باب نمبر ۱

# پیام بذریعہ جاوید اقبال





وہ بے شمار باتیں جو اقبال اپنے عہدِ نو کے متعلق خود اس سے یا دوسروں سے کہنا چاہتے ہیں، ان کی شاعری کے مختلف ادوار میں، مختلف مجموعہ ہائے کلام میں بکھری اور پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں، ان باتوں میں نہ باہم کوئی منطقی ربط ہے اور نہ تقدم و تاخر کا کوئی تعلق۔

اس کے باوجود کہ یہ سب خیالات داخلی طور پر ایک مضبوط منطقی اور فکری رشتے میں منسلک ہیں، وہ جب شعر کی صورت اختیار کرتے ہیں تو ربط اور تعلق کے یہ رشتے قائم نہیں رہتے۔ ہر خیال خیالوں کی اس زنجیر سے الگ ہو کر، جس میں فکر اور جذبے کی داخلی سطح پر وہ حلقہ بند ہے، ایک کڑی کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور شعر میں اپنے واضح وجود کا الگ اعلان کرتا ہے۔ اقبال کے جن شعروں اور نظموں کا اب تک تجزیہ کیا گیا، ان میں بات تو کوئی بھی ایسی نہیں جو اقبال کے منظم فلسفہ حیات کا جزو، عنصر یا حصہ نہ ہو، لیکن یہ سب باتیں اس منظم فلسفے کے منفرد اور منتشر اجزاء اور عناصر ہی کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ان میں تقدم و تاخر اور سبب اور نتیجے کا منطقی تعلق خود ہمارا ذہن پیدا کرتا ہے۔

لیکن اقبال کی چار نظمیں ایسی ہیں جن میں اقبال نے براہِ راست اپنے فرزند جاوید کا نام لے کر اسے مخاطب کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہاں جاوید سے مراد جاوید اقبال نہیں، بلکہ جاوید کے پردے میں ہر مسلم نوجوان ہے۔ ان چاروں نظموں میں نوجوانانِ اسلام کے نام اقبال کا پیغام ایک منطقی ربط بھی رکھتا ہے اور راست گفتگو کا اندازِ مخاطب بھی۔

صرف دو مقام ایسے ہیں جہاں جاوید کا نام اقبال کے فرزند کی حیثیت سے آیا ہے اور عام نوجوانانِ اسلام کی حیثیت سے نہیں آیا۔

یہ دو مقامات ”ارمغانِ حجاز“ (فارسی) کی دو رباعیات ہیں ملاحظہ ہوں۔

سحر جاوید را در سجدہ دیدم

بہ صبحش چہرہ شام بیارائے





پیام بذریعہ جاوید

یعنی میں نے صبح کے وقت اپنے بیٹے جاوید کو سجدہ ریز دیکھا۔ اس کی صبح سے میری شام کے چہرے کو زینت دے۔ یعنی میں تو آخری عمر کو پہنچ گیا ہوں۔ جب کہ جاوید کی زندگی کا آغاز ہے۔ خدا کرے، وہ میرے سرمایہ فکر و عمل کا وارث بن جائے۔ ایک اور رباعی میں اقبال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جاوید کے لیے دعا کرتے ہیں۔

ہمیں یک آرزو دارم کہ جاوید  
ز عشق تو بگیرد رنگ و بوئے

ظاہر ہے کہ علامہ اقبالؒ جس طرح اپنے پیارے فرزند کو عشق رسولؐ میں سرشار دیکھنا چاہتے تھے، اسی طرح ہر مسلم نوجوان کو بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ و بو میں بسا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔

پہلی نظم کا عنوان ہے ”جاوید کے نام“ جو بال جبریل کے صفحہ نمبر ۳۵۹ میں شامل ہے۔ اس کے بارے میں جناب جاوید اقبال اپنی مشہور تصنیف ”مئے لالہ فام“ میں لکھتے ہیں۔

”۱۹۳۱ء میں جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے ابا جان انگلستان گئے تو اس وقت میری عمر کوئی سات سال کے لگ بھگ تھی۔ میں نے انھیں ایک اوٹ پناگ سا خط لکھا اور خواہش ظاہر کی کہ جب وہ واپس تشریف لائیں تو میرے لیے ایک گراموفون لیتے آئیں۔ گراموفون تو وہ لے کر نہ آئے، لیکن میرا خط ان کی مندرجہ ذیل نظم کی شانِ نزول کا باعث ضرور بنا:۔

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر  
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر  
خدا اگر دلی فطرت شناس دے تجھ کو  
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر



ہیام بذریعہ جاوید

اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں  
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر  
میں شاخِ تاک ہوں، میری غزل ہے میرا ثمر  
مرے ثمر سے نئے لالہ قام پیدا کر  
مرا طریقِ امیری نہیں، فقیری ہے  
خودی نہ بچ، غریبی میں نام پیدا کر

پانچ اشعار پر مشتمل یہ نظم بہ ظاہر اقبال نے اپنے بیٹے جاوید ہی کے نام لکھی ہے، لیکن  
بہ غور دیکھا جائے تو وہ اس میں ملتِ اسلامیہ کے تمام نوجوانوں سے مخاطب نظر آتے ہیں۔  
فرماتے ہیں:

۱۔ اے بیٹے! تیرے لیے لازم ہے کہ علم و عمل کے ذریعے معاشرے میں اپنی  
شناخت کرائے اور وہ مرتبہ حاصل کرے جو عزت و احترام کا حامل ہے۔ اس کے لیے لازم  
ہے کہ قدیم روایات کر ترک کر کے خود کو نئی اور مثبت جہتوں سے ہم آہنگ کرے۔  
۲۔ خدا کرے، تجھے وہ فطرت شناس دل عطا ہو کہ تو ان اشیاء کے رموز بھی جان سکے  
جو قوتِ گویائی سے محروم ہیں، اور لالہ و گلاب جیسے پھولوں کی خامشی بھی تیرے لیے کلام بن  
جائے۔

۳۔ اے فرزندِ یورپ! یورپ کے علوم و فنون اور وہاں کی تہذیب و ثقافت کو حرفِ آخر تصور  
نہ کر۔ تجھے عروج حاصل کرنا ہے تو اپنی ہی تہذیب اور اپنے ہی وطن کی مٹی، اور اپنے ہی علوم و  
فنون سے وابستگی پیدا کر۔ مغربی تہذیب مصنوعی اور ناپائدار ہے، اور مشرق کے علم و فن اور  
تہذیب میں وطن کی مٹی کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔

۴۔ میری شاعری کو یوں سمجھو، جیسے میں انگور کی نیل ہوں، اور میری غزل اس کا ثمر  
ہے یعنی انگور۔ اب تیرا کام ہے کہ میری ثمر سے نئے لالہ قام پیدا کر اور اس سے استفادہ کر۔



پیام بذریعہ جاوید

سادہ لفظوں میں یوں کہیے کہ میں نے اپنی شاعری میں جو اسرار و رموز بیان کیے ہیں، ان کی معرفت حاصل کر کے پوری طرح ذہن نشین کر لے اور انھی پر کار بند ہو جا۔

۵۔ میں امیر آدمی نہیں ہوں۔ میرا طریقہ امیری نہیں، غریبی ہے۔ بیٹے خودی نہ بچ، غریبی میں نام پیدا کر۔

جاوید کے نام

نو جوانوں کے نام ایسا ہی پیغام ”جاوید کے نام“ سے دوسری نظم میں دیا گیا ہے۔ یہ نظم بھی بال جبریل (صفحہ ۳۳۰) میں شامل ہے۔ ہر چند یہ نظم علامہ اقبال نے اپنے فرزند ارجمند جاوید کے لیے تخلیق کی۔ اس میں کچھ نصیحتیں بھی ہیں، مشورے بھی ہیں، دعائیں بھی ہیں۔ لیکن دیکھا جائے تو یہ نظم محض جاوید کی ذات تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس کے مخاطب پوری ملتِ اسلامیہ کے نو جوان ہیں۔ پہلے یہ پانچ اشعار پر مشتمل نظم ملاحظہ ہو، پھر اس کا ترجمہ و تشریح۔

خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ  
خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ  
یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود  
ہزار گوئے فروغ و ہزار گوئے فراغ!  
ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی  
خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبتِ زاغ!  
حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی  
خدا کرے کہ جوانی تری، رہے بے داغ  
ظہر سکا نہ کسی خانقاہ میں اقبال  
کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ!



۱۔ پہلے شعر میں اقبالؒ فرماتے ہیں کہ اے فرزندِ عزیز! یہ حقیقت پوری طرح ذہن نشین کر لے کہ خودی ہی ایسا جذبہ ہے جس کو اپنانے سے فرد کو حیاتِ جاودانی نصیب ہو سکتی ہے اور وہ اپنے عمل سے ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ یہ خودی ہی ہے جو افراد کو عمرِ جاوداں اور قوموں کے عروج کے لیے روشنی فراہم کرتی ہے۔

۲۔ خواہ انسان کتنی ہی غربت، مفلسی یا گم نامی کی حالت میں زندگی بسر کرے، نہ اس کے پاس کوٹھی ہو نہ کار ہو نہ ٹیلیفون ہو نہ عہدہ ہو نہ خطاب ہو نہ جاگیر ہو۔ لیکن اگر وہ اس حقیقت کو مد نظر رکھے کہ میں ’’صاحبِ مقصود‘‘ ہوں یعنی مجھے اللہ نے اس لیے پیدا کیا ہے کہ میں اپنی خودی کی تربیت کر کے خلافتِ الہیہ کا مستحق بن جاؤں تو یہ تصور اسے فروغ (ترقی) بھی عطا کر سکتا ہے اور فراغ (سکونِ قلب) بھی۔ اصل مسئلہ بامقصد زندگی کا ہے۔

۳۔ اب ذرا ایک پرندے کوٹے کی جانب دیکھو۔ وہ ادھر ادھر منہ مار کر بڑی چالاکی اور عیاری سے اپنا پیٹ بھرنے کے لیے دوسروں کا مال تو ہاپ کر جاتا ہے، لیکن خود اپنی ذاتی جدوجہد کے ذریعے کبھی اپنی روزی حاصل کرنے کے قابل نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں بلند پروازی نہیں ہے۔ یہ بھی جان لو کہ اگر کسی بلند پرواز شاہین کا بچہ کوٹے کی صحبت میں رہے گا تو وہ اپنی فطری صلاحیتوں سے محروم ہو کر کوٹے کی سی عادتیں اختیار کرے گا۔ مراد یہ ہے کہ بری صحبت میں رہے گا تو وہ اپنی فطری صلاحیتوں سے محروم ہو کر کوٹے کی سی عادتیں اختیار کرے گا۔ مراد یہ ہے کہ بری صحبت سے گریز کرو کہ یہ انسان کے اپنے کردار کو گھن کی طرح چاٹ جاتی ہے۔

۴۔ پورے معاشرے پر نظر ڈالو، تو اس امر کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ انسانوں میں غیرت و حیا کا جذبہ مفقود ہو چکا ہے۔ کسی بھی برائی کو قبول کرتے ہوئے ان کو کسی طرح پشیمانی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ سو اے بیٹے! اس صورتِ حال کے پیشِ نظر میں اللہ تعالیٰ سے یہی دعا کرتا ہوں کہ تجھ میں غیرت و حیا کا جذبہ برقرار رہے اور تیری جوانی ہمیشہ



— پیام بذریعہ جاوید —

داغ دار ہونے سے بچی رہے۔

۴۔ آخری شعر میں اقبال فرماتے ہیں کہ جہاں تک میری زندگی اور کردار کا تعلق ہے، اس امر سے واضح ہو جائے گا کہ میں ایک خوش طبع، خوش مزاج، خوش اخلاق اور خوش وضع ہونے کے باعث ان خانقاہوں کے قریب تک نہ پھٹک سکا جو تنگ ظرف، خشک طبع اور فساد خیز ملاؤں کی کمین گاہوں میں بنی ہوئی ہیں۔ مراد یہ ہے کہ نو جوانوں کو جہاں رند مشرب لوگوں کی صحبت سے گریز کرنا چاہیے، وہاں ایسی خانقاہوں سے بھی بچنا چاہیے، کہ ہر دو مقامات کا ماحول غیرت و حیا سے عاری ہو چکا ہے اور نو جوان نسل کے لیے زہر قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

جاوید سے

اس عنوان کے تحت یکے بعد دیگرے تین نظمیں ”ضرب کلیم“ میں شامل ہیں۔ ان تین نظموں کا مخاطب بظاہر ”جاوید“ ہے مگر درحقیقت مراد تمام مسلم نو جوان ہیں، خواہ وہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں آباد ہوں۔ ان تینوں نظموں کا پورا متن اور مطلب ملاحظہ ہو۔

(۱)

غارت گر دیں ہے یہ زمانہ  
ہے اس کی نہاد کافرانہ  
دربار شہنشی سے خوشتر  
خوشتر مردانِ خدا کا آستانہ  
لیکن یہ دور ساحری ہے  
انداز ہیں سب کے جادوانہ  
سرچشمہ زندگی ہوا خشک  
باقی ہے کہاں بے شبانہ



ہیام بخریصہ جاوید

خالی ان سے ہوا دبستان  
تھی جن کی نگاہ تازیانہ  
جس گھر کا مگر چراغ ہے تو  
ہے اس کا مذاق عارفانہ  
جوہر میں ہو لالہ تو کیا خوف  
تعلیم ہو گو فرنگیانہ  
شاخ گل پر چمک و لیکن  
کر اپنی خودی میں آشیانہ  
وہ بحر ہے آدی کہ جس کا  
ہر قطرہ ہے بحر بے کرانہ  
دہقان اگر نہ ہو تن آساں  
ہر دانہ ہے صد ہزار دانہ  
”غافل منشیں نہ وقت بازی ست  
وقت ہنر است و کار سازی ست“

مطلب (۱) پہلے شعر میں اقبال نوجوانانِ اسلام سے کہہ رہے ہیں کہ عصرِ حاضر کی  
چمک دمک اور فریب میں نہ آ جاتا۔ یہ ظاہر یہ در پر بڑا ترقی یافتہ اور تہذیب و تمدن کا دورِ نظر آتا  
ہے، لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اہل مغرب کی سازشی فطرت اور غلط روش کی وجہ  
سے موجودہ دورِ دینِ اسلام کو برباد کرنے والا دور ہے اور اس کی سرشت و جبلت میں کفر اور  
لادینی کے سوا اور کچھ نہیں ہے، اس لیے عصرِ حاضر کے برے اثرات سے بچنا ضروری ہے۔  
(۲) بادشاہوں کے درباروں اور ان کے سرکار میں حاضری سے یہ بہتر ہے کہ اللہ  
کے برگزیدہ بندوں (فقیروں اور درویشوں) کی چوکھٹ پر حاضری دی جائے۔

پیام مذبذبہ جاوید

(۳) لیکن یہ موجودہ دور جادوگری کا دور ہے اور اس کے سارے طور طریقے جادو جیسے ہیں۔ جس طرح جادوگر ہمارے خیالات اور نظروں کو باندھ کر نقلی چیزوں کو اصل بنا کر پیش کرتا ہے اور ان چیزوں کو جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا، ان کو وجود دے کر ہمارے سامنے لاتا ہے، اسی طرح عہد حاضر بھی غلط چیزوں کو صحیح بنا کر پیش کر رہا ہے، اور اس کی یہ ساحری اور جادوگرانہ فریب دہی ہمیں نقل کو اصل سمجھنے پر مجبور کر رہی ہے۔

(۴) دور حاضر میں اہل مغرب کی جادوگری کی وجہ سے ایسی ہوا چلی ہے یا ایسے اسباب پیدا ہوئے ہیں، کہ جن کی وجہ سے دریائے زندگی کے سوتے خشک ہو گئے ہیں اور رات کی وہ شراب، جو ہمارے آباؤ اجداد اور ہمارے بزرگ ہمیں پلاتے تھے، یعنی شراب معرفت، اب باقی نہیں رہی ہے۔

(۵) دور حاضر کے مدرسے ان استادوں اور بزرگوں سے خالی ہو چکے ہیں جن کی نگاہ اپنے طالب علموں کو راہِ راست پر رکھنے کے لیے تازیانے کا کام دیتی تھی اور وہ اپنی نظر اور صحبت سے ان کی صحیح تربیت کرتے تھے۔

(۶) اس شعر میں جاوید کو خاص طور پر خطاب کیا گیا ہے اور کہا ہے کہ تو جس گھر کا چراغ ہے، اس خاندان کا ذوق اور مزاج ہمیشہ سے صوفیانہ اور عارفانہ رہا ہے۔ تمہیں بھی چاہیے کہ اس ذوق عارفانہ کو اپنے اندر پیدا کرو اور زندہ و قائم رکھو۔

(۷) علامہ نے یہاں ایک اصولی اور بنیادی بات کہی ہے اور وہ یہ کہ اگر مسلمان کلمہ توحید پڑھ کر دل سے مسلمان بن چکا ہے اور اس کی سرشت میں اس کا اثر پختہ ہو چکا ہے تو پھر اہل مغرب کی تعلیم حاصل کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں، کیونکہ وہ ایمان جو اس کی اصلیت میں ہوگا، وہ اسے کھرے اور کھوٹے کی شناخت کر دے گا اور فرنگی تعلیم سے وہی چیز حاصل کرے گا جو بہ حیثیت مسلمان اس کے فائدے کی ہوگی اور باقی سب کچھ رد کر دے گا۔

(۸) اس شعر میں ایک پرندے کی مثال دے کر راز کی بات بتائی ہے، کہ جس طرح



پیامِ ہدیرِ جلید

پرنہ پھولوں کی شاخ پر چمکتا ہے، لیکن نظر اپنے گھونسلے پر رکھتا ہے اور ادھر ادھر گھوم کر، پھر اپنے آشیانے میں آ جاتا ہے، اسی طرح تو بھی، اے مسلم نو جوان! جہاں چاہے جا، جو چاہے پڑھ، لیکن اپنی خود نگری اور خود شناسی کے گھر کو نہ بھول، اور اپنے دینی شعائر اور اپنی روایات کو ہر وقت پیش نظر رکھ۔

(۹) آدمی کوئی معمولی اور سرسری چیز نہیں ہے۔ خاص طور پر مرد مومن جو خدا کا نائب ہے، دیکھنے میں تو وہ پانی کے ایک قطرے کی مانند ہے، یعنی محض ایک فرد نظر آتا ہے، لیکن وہ ایسا قطرہ ہے کہ وہ بے کنار سمندر سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ سو اے مسلم نو جوان! تو اپنی اس اصلیت کو مت بھول۔

(۱۰) اس شعر میں علامہ نے مسلم نو جوان کو محنت کی قدر و قیمت اور فضیلت سے آگاہ کیا ہے اور ایک کسان کی مثال دے کر سمجھایا ہے کہ اگر کسان آرام طلب اور تن آسان نہ ہو، اور رات دن خون پسینا ایک کر کے محنت کرنے کا عادی ہو تو وہ اس ایک دانے سے جو وہ زمین میں بوتا ہے، سو ہزار دانے لیتا ہے۔ اس لیے اے جوان! تو بھی محنت کر تا کہ کامیابی اور خوش حالی تیرے ہاتھ آئے۔

(۱۱) اے مسلم نو جوان! اے میرے بیٹے! یہ کھیل کود اور تفریح کا وقت نہیں ہے، بلکہ کچھ سیکھنے کا وقت ہے۔ غافل ہو کر مت بیٹھ کوئی نہ کوئی ہنر سیکھ اور کوئی نہ کوئی کام کر کے دکھا۔

(۲)

سینے میں اگر نہ ہو دل گرم  
رہ جاتی ہے زندگی میں خامی  
نخچر اگر ہو زیرک و چست  
آتی نہیں کام، کہنہ دای





— پیام بذریعہ جلوس —

ہے آبِ حیات اسی جہاں میں  
شرط اس کے لیے ہے تشنہ کامی  
غیرت ہے طریقہ حقیقی  
غیرت سے ہے فقر کی غلامی  
اے جانِ پدر، نہیں ہے ممکن  
شاہیں سے تدو کی غلامی  
نایاب نہیں متاعِ گفتار  
صد انوری و ہزار جامی  
ہے میری بساط کیا جہاں میں  
بس ایک فغانِ زیرِ بامی  
اک صدقِ مقال ہے کہ جس سے  
میں چشمِ جہاں میں ہوں گرامی  
اللہ کی دین ہے، جسے دے  
میراث نہیں، بلند نامی  
اپنے نورِ نظر سے کیا خوب  
فرماتے ہیں حضرت نظامی  
جائے کہ بزرگِ بایت بود  
فرزندِ منِ ندرت سود

مطلب: (۱) اگر آدمی کے سینے میں عشق کی حرارت رکھنے والا دل نہ ہو تو سمجھیے کہ  
اس کی زندگی خام ہے۔ یعنی اس میں کوئی نہ کوئی خامی یا کمی رہ گئی ہے۔ اس لیے زندگی کو پختہ  
بنانے کے لیے عشق ضروری ہے۔



پیام بذرِ صبح جلاوید

(۲) اگر شکار (چاہے پرندہ ہو یا جانور) دانا اور چالاک ہو تو کہنہ مشق شکاری بھی اسے اپنے جال میں پھانسنے میں ناکام رہے گا۔ مراد یہ ہے کہ اگر میری قوم کے نوجوان دانا ہوشیار اور بیدار ہوں تو کوئی ان کو اپنا سیاسی غلام نہیں بنا سکتا۔

(۳) آب حیات کا چشمہ ضرور موجود ہے جس کا پانی پینے سے ہمیشہ کی زندگی مل جاتی ہے، اس چشمے کو ڈھونڈنے کی شرط یہ ہے کہ آدمی کو اس کی پیاس ہو۔ مقصد یہ ہے کہ کسی بھی منزل کے حصول کے لیے اس تک پہنچنے کی آرزو کا ہونا ضروری ہے۔

(۴) درویش دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک غیرت مند اور خوددار، دوسرے بے غیرت اور بے حیا۔ اقبال نے یہاں سچی درویشی اور فقر کا ذکر کیا ہے کہ اس میں غیرت، خودداری اور حیا ہوتی ہیں۔ صحیح فقر (درویشی) کی غلامی غیرت (خودداری) سے ہاتھ آتی ہے۔

(۵) اے بیٹے! شاہین بن، تیر نہ بن، کیونکہ شاہین کبھی تیر کا غلام یا شکار نہیں بن سکتا۔ ہمیشہ تیر ہی شاہین کا شکار بنتا ہے۔ مقصود اس نصیحت سے یہ ہے کہ شاہین جیسی خوددار اور آزاد زندگی گزارو۔ تیر جیسی بے ہمت اور غلام زندگی نہ گزارو۔

(۶) متاعِ گفتار یعنی شاعری کوئی ایسی دولت نہیں ہے جو کہیں نہ ملے۔ اس دنیا میں انوری اور جامی جیسے سینکڑوں ہزاروں شاعر موجود ہیں۔ البتہ دیکھنا یہ ہے کہ کس شاعر کی شاعری افراد یا قوم کو بیدار کرتی ہے۔ اور کس کی شاعری انھیں سلاتی ہے۔ اس لیے اگر شاعری کا ذوق ہو تو ایسا شعر کہہ کہ جس سے سوئی ہوئی قوم جاگ اٹھے۔

(۷) پچھلے شعر میں علامہ نے شاعر اور شاعری کی بات کی ہے۔ علامہ چونکہ خود بھی شاعر ہیں، اس لیے کہتے ہیں کہ اس دنیا میں بطور شاعر میری حیثیت ہی کیا ہے۔ میری شاعری تو اس آہ و فغاں کی طرح ہے جو کوئی شخص چھت کے نیچے کھڑے ہو کر کرے۔ مراد یہ ہے کہ میں تو غلام قوم میں پیدا ہوا ہوں۔ اگر آزاد قوم میں پیدا ہوا ہوتا تو میری آہ و فغاں اس شخص کی



پیام ہذریعہ جاوید

طرح ہوتی جو چھت کے اور پر کھڑے ہو کر بلند کرتا۔ وہ فریاد سنی بھی جاتی ہے، میری فریاد کون سنتا ہے۔

(۸) اس شعر میں بھی علامہ نے شاعری ہی کی بات کو آگے بڑھایا ہے اور کہا ہے کہ میری شاعری کچی شاعری ہے۔ میں اپنے کلام میں وہی کچھ کہتا ہوں جو ایک سچے شاعر کو کہنا چاہیے، اس لیے میں لوگوں کی نظروں میں بلند نام، عزت دار اور قدر و منزلت والا جانا اور سمجھا جاتا ہوں۔

(۹) اپنے نام کی شہرت اور بلند نامی کوئی خاندانی وراثت نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے جسے چاہے عطا کر دے اور اس کے لیے اعلیٰ کردار و عمل ضروری ہے۔ یہ بھی اللہ ہی کی توفیق ہے۔

(۱۰) اور (۱۱) ان دو شعروں میں علامہ نے براہ راست اپنے بیٹے جاوید کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ دیکھو، مشہور فارسی شاعر نظامی گنجوی نے اپنے بیٹے سے کیا اچھی بات کہی ہے کہ جس جگہ تجھے بزرگی و احترام کا مرتبہ حاصل ہونا چاہیے، وہاں تجھے میرا بیٹا ہونا کوئی فائدہ نہ دے گا، بلکہ تیرے ذاتی جوہر اور اوصاف کام آئیں گے، کیونکہ بزرگی و عزت اپنے کردار و عمل سے ملتی ہے، وراثت سے نہیں۔

مومن پہ گراں ہیں یہ شب و روز  
دین و دولت تمار بازی  
ناپید ہے بندہ عمل مست  
باقی ہے فقط نفس درازی  
ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر  
جس فقر کی اصل ہے حجازی  
اس فقر سے آدمی میں پیدا  
اللہ کی شان بے نیازی



پیام ہنریصہ جاوید

کنجشک و حمام کے لیے موت  
ہے اس کا مقام شاہبازی  
روشن اس سے خرد کی آنکھیں  
بے سرمہ بوعلی و رازی  
حاصل اس کا شکوہ محمود  
فطرت میں اگر نہ ہو ایازی  
تیری دنیا کا یہ سرائیل  
رکھتا نہیں ذوق نے نوازی  
ہے اس کی نگاہ عالم آشوب  
درپردہ تمام کار سازی  
یہ فقر غیور جس نے پایا  
بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی  
مومن کی اسی میں ہے امیری  
اللہ سے مانگ یہ فقیری

مطلب: (۱) اس نظم میں علامہ اقبال اپنے بیٹے جاوید کو اور اس کے ذریعے سے تمام مسلم نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں، مسلمانوں کے لیے اس دور کے شب و روز بڑے کٹھن اور مشکل ہیں، کیونکہ موجودہ زمانہ مغربی تہذیب و تمدن کی خرابیوں کی وجہ سے اتنا خراب ہو چکا ہے کہ دین اور حکومت دونوں جواری بن گئے ہیں۔ دونوں اپنے اغراض و مفادات کے لیے عوام کو داؤ پر لگائے ہوئے ہیں۔

(۲) اس زمانے میں صاحبِ کردار اور عمل مست لوگ ناپید ہو گئے ہیں، البتہ سانسوں کو طول دینے والے یعنی بے کار زندگی گزارنے والے لوگ عام ہیں۔



(۳) اگر تجھ میں درویشی کی خواہش ہو اور اس کے حصول کی ہمت ہو تو ایسا فقر (درویشی) تلاش کر، جس کی جز مجاز میں ہو، یعنی وہ فقر جو اسلامی فقر ہے، وہ فقر جس پر رسول کریمؐ کو بھی فخر تھا اور آپؐ نے جس پر ”الفقر فخری“ کہا تھا۔ اس کے سوا جو درویشی ہے وہ غیر اسلامی بھی ہے اور محض ڈھونگ بھی۔

(۴) اے بیٹے، میں جس اسلامی اور مجازی فقر کی بات کر رہا ہوں، اس فقر سے آدمی کے اندر اللہ کی شان بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ فقر کسی کا یا کسی شے کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ فقر جس میں احتیاج ہو یا خود محتاج ہو، وہ مجازی نہیں ہے۔

(۵) اے بیٹے، میں جس فقر کی بات کر رہا ہوں، وہ شاہبازوں جیسے بڑے مرتبے والے فقر کی بات ہے۔ شاہباز فضاؤں میں آزادانہ اڑتا ہے، پہاڑوں پر اپنا ڈیرا بناتا ہے، اپنا شکار خود کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ فقر جس سے نبی کریمؐ نے بھی پناہ مانگی ہے، وہ محتاجی کا فقر ہے جس میں فقیر چیزوں (کجشک) اور کوتروں (حمام) کی طرح دانہ و نکا کا محتاج ہوتا ہے اور دوسروں کے بھروسے پر زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ اس کی زندگی نہیں، موت ہے۔

(۶) اس شعر میں بھی اسلامی فقر کی بات کی گئی ہے، اور کہا ہے کہ ایک عقل تو وہ ہے جو اپنی آنکھوں میں بوعلی سینا اور فخر الدین رازی کے فلسفے کا سرمہ ڈالے تو روشن ہوتی ہے، لیکن یہ عقل طالب کو منزل مقصود تک نہیں پہنچاتی اور حقیقت کا مشاہدہ نہیں کراتی۔ دوسری عقل وہ ہے جسے فقر کا سرمہ روشن کرتا ہے۔ یہ عقل منزل مقصود پر بھی پہنچاتی ہے اور حقیقت کا مشاہدہ بھی کراتی ہے۔ اس لیے اے بیٹے! فقر والی عقل کی تمنا کر۔

(۷) اسلامی فقر محمود غزنوی کا سادہ بدہ اور شکوہ لیے ہوئے ہوتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس کی سرشت میں ایازمی (غلامی) نہ ہو۔ محمود غزنوی اپنے ایک غلام ایاز کو بہت چاہتا تھا اور اس کی ہر خواہش اور مرضی کو فوقیت دیتا تھا، جس کے نتیجے میں اس کے ذاتی شکوہ اور بدہ بے



۔۔۔۔۔ بیام، بذریعہ جلوید ۔۔۔۔۔

میں فرق آتا تھا۔ فقر بھی اگر کسی کا محتاج ہو اور اپنی شان بے نیازی اور شکوہ برقرار نہ رکھتا ہو تو وہ بھی درست نہیں۔ اسلامی فقر کا جلال اور دبدبہ اس میں ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہ ہو، دوسرے اس کے محتاج ہوں۔

(۸) دورِ جدید، جس نے اپنی مادی ترقی کے باوجود، شرفِ انسانیت کو برباد کر کے رکھ دیا ہے، اپنے اندر ایسی صلاحیت و طاقت نہیں رکھتا کہ مردہ دلوں کو زندہ کر دے۔ جس طرح قیامت کے روز اسرافیل صور پھونکے گا تو سب مردے قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے، دورِ جدید کی بانسری میں اس قسم کی تاثیر نہیں ہے۔ ہاں فقر کی بانسری بجانے کا اگر ذوق نصیب ہو تو وہ اسرافیل کی طرح آدمی کے مردہ دل کو زندہ کر سکتی ہے اور زمانہ جدید کے آدمی کو پھر سے حیوان سے انسان اور مردہ دل سے زندہ دل بنا سکتی ہے۔

(۹) مردِ فقیر کی نگاہ اسرافیل کی طرح مردہ دلوں کو زندہ کرنے والی ہوتی ہے۔ اس کی نگاہ دنیائے دل میں تلاطم پیدا کر کے اس کو صحیح دل بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے، ایسی نگاہ جو دنیا میں انقلاب پیدا کر دے، لوگوں کی تقدیریں بدل دے، وہ پوشیدہ طور پر کارساز (دوسروں کے کام بنانے والی) ہوتی ہے۔ آج کے پیشہ ور فقیر خود گداگر ہیں۔ وہ اپنی محتاجی دور نہیں کر سکتے، دوسروں کے بگڑے ہوئے کام کیسے بنائیں گے۔ یہ کام اصل فقر اور اسلامی فقیر کا ہے کہ وہ لوگوں کی کارسازی کرتا ہے۔

(۱۰) جس شخص کو خودداری اور غیرت والا فقر حاصل ہو جاتا ہے، اسے میدانِ جنگ میں دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے تلوار اور نیزے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ان آلاتِ حرب کے بغیر ہی فریقِ مقابل کے سامنے آ جاتا ہے اور اپنی نگاہ سے تلوار اور نیزے کا کام لیتا ہے۔ مردِ فقیر کی نگاہ تقدیریں بدل دیتی ہے۔ وہ تلوار کا نہیں، نگاہ کی ضرب لگانے والا مردِ میدان ہوتا ہے، اور ہمیشہ فتح یاب ہو کر غازی بنتا ہے

(۱۱) جو اہل ایمان واقعی مردِ مومن ہوتا ہے، اس کی امیری دولت کی امیری نہیں



پیام بذریعہ جاوید

ہوتی بلکہ دولت فقر کی امیری ہوتی ہے۔ دھن دولت تو چھاؤں ہے، آج ہے، کل نہیں ہے۔ فقر کی دولت وہ دولت ہے جس کو نہ زوال ہے اور نہ کوئی اسے چھین سکتا ہے۔ مرد فقیر کسی کا محتاج نہیں ہوتا، بلکہ سب اس کے محتاج ہوتے ہیں اور وہ محتاجوں کی احتیاج دور کرتا ہے۔ اس کی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ وہ خود کسی کا محتاج ہو۔ اے بیٹے! اللہ سے دعا کر کہ وہ تمہیں فقر کی یہ دولت عطا کر دے۔ دنیا کی دولت تو آنی جانی شے ہے، اس پر فقر کی دولت کو قربان نہ کر دینا۔

(۴)

خطاب بہ جاوید (سخن بہ نژاد نو) اقبال کی ایک ایسی نظم ہے جس میں انھوں نے خود نو جوان نسل (نژاد نو) کے متعلق اپنے خیالات اور پیغام کو ایک واضح ربط اور تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے اور یوں یہ نظم نو جوانوں کے متعلق اقبال کے جملہ تصورات کا ایسا مرقع بن گئی ہے جس میں فکر اور شعر دونوں کے رنگ پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں اور آپس میں مل جل کر مرقع کو ایسی صورت دیتے ہیں کہ ان سے قلب و نظر دونوں کو زندگی ملتی ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے ”خطاب بہ جاوید“۔ دوسرا ذیلی عنوان ہے ”سخن بہ نژاد نو“۔ گویا اقبال کو خود بھی خیال تھا کہ کہیں ”خطاب بہ جاوید“ کا مطلب جاوید بیٹے سے خطاب سے نہ لیا جائے، اس لیے انھوں نے دوسرے عنوان سے وضاحت کر دی کہ یہ گفتگو دراصل نئی نسل سے ہو رہی ہے۔

یہ نظم ”جاوید نامہ“ کے آخر میں درج ہے، جس کے مطالب مولانا اسلم جے راج پوری مرحوم کی تجویز کے مطابق پورے عالم اسلام کے نصاب تعلیم کا جز بننے کے لائق ہیں۔ اس فارسی نظم کے مطالعے سے پڑھنے والا جن گونا گوں کیفیتوں سے دوچار ہوتا ہے، ان کا ظہور صرف اس وقت ہوتا ہے جب فلسفہ و شعر کی سطح ایک ہو جائے اور دونوں اپنا سفر پوری طرح ہم آہنگ ہو کر طے کریں۔ یہاں اس نظم کا پورا فارسی متن، ترجمہ اور کسی قدر تشریح کے



پیام بذریعہ جاوید

ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ امید ہے کہ نوجوانانِ پاکستان یہ نظم حفظ کر لیں گے۔

پہلا بند

ایں سخن آراستن بے حاصل است  
بر نیاید آنچه در قعر دل است  
گرچہ من صد نکتہ گفتم بے حجاب  
نکتہ دارم کہ ناید در کتاب  
گر گویم می شود پیچیدہ تر!  
حرف و صوت اورا کند پوشیدہ تر  
سوز او را از نگاہ من بگیر  
یا ز آہ صبح گاہ من بگیر!

(۱) یہ جو میں نے گفتگو کی انجمن سبائی ہے، اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا، کیونکہ جو کچھ میرے قلب کی گہرائی میں ہے، اسے لفظوں کی زبان میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ مراد یہ ہے کہ دل کی بات زبان ادا نہیں کر سکتی۔

(۲) اگرچہ میں نے (اپنی شاعری میں) سیکڑوں رمز کی باتیں کھول کر بیان کی ہیں، لیکن میں ایک ایسا نکتہ (رمز) رکھتا ہوں جو تحریر میں نہیں آ سکتا۔

(۳) اگر میں یہ نکتہ بیان کرتا ہوں تو بیان کرنے سے یہ مزید الجھ جائے گا۔ میرے الفاظ اور میری آواز اس نکتے کو پہلے سے بھی زیادہ پوشیدہ کر دے گی۔

(۴) اس نکتے کا سوز یا تو میری نگاہ سے یا میری آہ سحرگاہی سے حاصل کر۔ مراد یہ ہے کہ اس نکتے نے میری نگاہ میں جو سوز اور میری آہ سحرگاہی میں جو درد پیدا کیا ہے، اگر تو اس کو میرے دل کی باریک بات کا نشان سمجھے تو شاید اس سے اصل بات کی طرف رجوع کر سکے، لیکن یہ اسی وقت ہو سکے گا جب تو خود صاحبِ سوز ہوگا۔





..... پیام بذریعہ جاوید .....

اقبال نے اپنی ساری زندگی اپنی شاعری کے ذریعے نوجوانوں کی جو فکری رہنمائی کی ہے، ان اشعار میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جس ایک نکتے کی طرف اقبال اپنے نوجوانوں کی توجہ مبذول کر رہے ہیں، اس کے متعلق اقبال کا خیال ہے کہ وہ اگر ”حرف و صوت“ کی مدد سے بیان کیا جائے تو اس کا مفہوم واضح ہونے کے بجائے پوشیدہ ہو جائے گا۔ اس لیے اقبال کہتے ہیں کہ اس نکتے کا راز اگر تمہیں کہیں ملے گا تو میری نگاہ میں یا میری آہِ حُر کا ہی میں ملے گا۔

دوسرا بند

مادرت درسِ نخستین با تو داد  
غنچہ تو از نسیم او کشاد  
از نسیم او ترا ایس رنگ و بوست  
اے متاعِ ما بہائے تو از بوست  
دولتِ جاوید ازو اندوختی  
از لب او لا الہ آموختی  
اے پسر! ذوقِ نگہ از من بگیر  
سوختن در لا الہ از من بگیر  
لا الہ گوئی؟ بگو از روئے جاں  
تا زاندام تو آید بوئے جاں  
مہر و مہ گردد ز سوزِ لا الہ  
دیدہ ام ایس سوز را در کوہ و کہ!  
ایس دو حرفِ لا الہ گفتار نیست  
لا الہ جز تیغِ بے زہار نیست



پیام بذریعہ جاوید

زیستن باسوز او تہاری است

”لا“ ضرب است و ضرب کاری است

مطلب: (۱) بیٹے! پہلا سبق تجھے تیری ماں نے دیا اور تیرا غنچہ اس کی نسیم سے کھلا۔  
مراد یہ ہے کہ پہلی تربیت گاہ تیری ماں کی گود تھی، جس نے لوریاں دے دے کر تیرے کانوں میں ”لا الہ“ کا رس گھولا۔

(۲) یہ تیرے اندر جو رنگ و بو ہے، یہ سب ماں کی نسیم سے ہے۔ اے میری متاع عزیز! تیری قیمت ماں کی تربیت سے ہے کہ اسی کی تربیت نے وہ کچھ بنایا ہے، جو تواب ہے۔  
(۳) تو نے (ایمان اور اسلام) کی ہمیشہ رہنے والی دولت اسی سے حاصل کی ہے۔  
تو نے یہ لا الہ ماں کے ہونٹوں ہی سے سن کر سیکھا ہے۔

(۴) اس کا جو کام تھا، وہ اس نے کر دیا۔ اے بیٹے! اب نگاہ کا ذوق مجھ سے حاصل کر۔ لا الہ (کلمہ توحید) تو تو نے ماں سے سیکھ لیا ہے، اب لا الہ کی آگ میں جلنا مجھ سے سیکھ۔ مراد یہ ہے کہ لا الہ کو قال (محض گفتگو) سے گزار کر حال (قلبی کیفیت) بنانے کا گر مجھ سے سیکھ۔

(۵) اگر تو لا الہ کہتا ہے تو پوری روحانی قوت سے کہہ، تاکہ تیرے جسم سے روح کی خوشبو آئے۔ زبان سے کلمہ توحید ضرور پڑھ، مگر دل سے اس کا اقرار بھی کر۔ کلمہ توحید کی روح کو اپنے اندر بسا کر اس کے مطابق زندگی بسر کر۔ تیرا ہر رنگ اور تیرا ہر بال توحید کی گواہی دے، یہ ہے کلمہ توحید کے پڑھنے اور اس کے اقرار کا مقصد۔

(۶) چاند اور سورج لا الہ کے سوز سے گردش کرتے ہیں۔ میں نے اس سوز کو پہاڑ اور تنکے میں، یعنی کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں دیکھا ہے۔ یہ ہے وہ نکتہ توحید، جس کے گرد ہر چیز دائرے کی طرح گھومتی ہے۔

(۷) یہ دو حرف ”لا الہ“ (کوئی معبود نہیں، اللہ کے سوا) محض گفتگو نہیں ہیں۔ بیٹے یاد رکھ، یہ لا الہ بے زہار تلوار کے سوا کچھ نہیں (بے زہار تلوار کو شمشیر جو ہر دار بھی کہتے

پیام بذریعہ جاوید

ہیں۔ یہ ایسی تلوار ہوتی ہے جس سے کسی کو پناہ نہ مل سکے، جس کے وار کو روکا نہ جاسکے۔  
(۸) اس لا الہ کے سوز میں جان قہاری ہے۔ لا الہ ایک ضرب ہے اور کاری ضرب ہے یعنی زبان سے لا الہ کہہ کر یہ سمجھ لینا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں، درست نہیں ہے۔ مسلمان اس وقت ہوتا ہے جب وہ توحید کا دل سے اقرار کرتا ہے اور اقرار کرنے کے بعد پہلے خود پر اسے نافذ کرتا ہے اور پھر دوسروں پر اس کا رنگ جاتا ہے۔  
اس بند میں یہ بتانے کے بعد کہ ”لا الہ“ کی دولت تو نے اپنی مشفق ماں کی آغوش میں رہ کر حاصل کی، اقبال کہتے ہیں کہ ”لا الہ“ کی آگ میں جلنے کا سبق تو مجھ سے سیکھ، لیکن یہ سبق تیری سمجھ میں اس وقت آئے گا جب تو ذوق نگاہ کی دولت بیدار مجھ سے حاصل کرے۔  
اقبال بڑے لطیف انداز میں اپنے بیٹے کو یہ بتاتے ہیں کہ ”لا الہ“ کے سوز سے سورج اور چاند گردش کرتے ہیں اور کوہ و ماہ میں اسی کے سوز کا عکس نظر آتا ہے۔ اے بیٹے! لا الہ کے ان دو حرفوں کو محض گفتار مت سمجھ۔ ان دو حرفوں میں شمشیر جو ہر دار کی قوت ہے۔ ”لا الہ“ نہ صرف ضرب ہے بلکہ ضرب کاری ہے۔

تیسرا بند

مومن و پیش کساں بستان نطق  
مومن و غداری و فقر و نفاق  
با پیشیزے دین و ملت را فروخت  
ہم متاع خانہ و ہم خانہ سوخت  
لا الہ اندر نمازش یود و نیست  
نازبا اندر نیازش یود و نیست  
نور در صوم و صلوات او نمازند  
جلوہ در کائنات او نمازند!



پیام ہدیرعہ جلاوید

آنکہ بود اللہ اُورا ساز و برگ  
فتنہ اُو چ مال و ترسِ مرگ  
رفت ازو آن مستی و ذوق و سرور  
دین اُو اندر کتاب و او بگور  
صحبتش باعصر حاضر در گرفت  
حرفِ دیں را از دو پیغمبر گرفت  
آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد  
آں زج بیگانہ و ایں از جہاد  
تا جہاد و حج نماںد از واجبات  
رفت جاں از بیکرِ صوم و صلوات  
روح چوں رفت از صلوات و از صیام  
فرد ناہموار و ملت بے نظام!  
سینہ ہا از گرمیِ قراں تہی  
از چنیں مرداں چہ امید ہی  
از خودی مردِ مسلمان درگذشت  
اے خضر دستے کہ آب از سرگذشت

مطلب: (۱) مومن ہو کر غلامی کا کپڑا کمر پر باندھنا، مومن ہو کر غداری، مفلسی اور نفاق کی زندگی بسر کرنا، یہ متضاد باتیں ہیں۔

(۲) اب اسی مومن نے ایک کوڑی کے عوض دین اور قوم کو فروخت کر دیا۔ اس نے گھر اور گھر کا اثاثہ جلا دیا۔

(۳) کبھی اس کی نمازوں میں لا الہ (توحید کا رنگ) تھا۔ اب نہیں ہے۔ اس کے



----- پیام بذریعہ جلوبند -----

نیاز میں کبھی ناز تھا۔ اب نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور جس نیاز سے وہ سر بہ سجود ہوتا تھا، اس میں ایک مومنانہ شان تھی جو اب نہیں ہے۔

(۴) اس کے روزوں اور اس کی نمازوں میں نور نہیں رہا۔ اس کی کائنات میں جلوہ حق نہیں رہا۔ یعنی آج اس کی نمازیں اور روزے بے تحشی ہیں۔

(۵) وہ جس کی زندگی کا ساز و سامان اللہ تھا، اس کا فتنہ حب مال اور اس کا خوف موت ہے۔ اب وہ مال کی محبت میں گرفتار ہے اور اللہ کی راہ میں جان دینے سے ڈرتا ہے۔ کبھی وہ اپنے مال اور اپنی جان کو اللہ کی ملکیت سمجھتا تھا۔ اس لیے ان کو بے دریغ اس کی راہ میں خرچ کر دیتا تھا، لیکن اب اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہوئے ان کو خرچ نہیں کرتا۔

(۶) اب اس سے ذوق و سرور کی مستی چلی گئی ہے۔ اس کا دین کتاب میں اور وہ خود قبر میں ہے، یعنی اس نے قرآن پر عمل چھوڑ دیا ہے اور قبر کے مردوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہے

(۷) اس نے عصرِ حاضر کی صحبت اختیار کر لی ہے اور اس نے اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر زمانہ حال کے دو جھوٹے پیغمبروں کا دین قبول کر لیا ہے۔

(۸) ان دو پیغمبروں میں سے ایک ایران کا تھا، اور دوسرا ہندی نسل کا تھا۔ ایرانی حج سے بیگانہ تھا اور ہندی جہاد سے بیگانہ تھا۔ (ایرانی جھوٹے نبی کا نام مرزا حسین علی بہا اللہ ہے۔ یہ ۱۸۱۷ء میں ایران کے مقام نور میں پیدا ہوا۔ اس نے صرف حج ہی نہیں، بلکہ پوری شریعت محمدی کو منسوخ کر دیا۔ اس کے پیروکار بہائی کہلاتے ہیں۔ ہندوستان میں پیدا ہونے والے جھوٹے نبی کا نام مرزا غلام احمد تھا جو ۱۸۳۸ء میں قادیان میں پیدا ہوا۔ اس نے نبوت کا دعویٰ کرتے وقت جہاد کی لٹی کر دی۔)

(۹) جب حج اور جہاد مسلمانوں کے لیے واجب نہ رہے تو پھر نماز اور روزے سے بھی جان نکل گئی یعنی وہ بھی بے اثر ہو گئے۔



پیام بذریعہ جاوید

(۱۰) جب نماز اور روزے سے روح نکل گئی تو فرد بے لگام اور ملت بے نظام ہو گئی۔

(۱۱) مسلمان کے سینے قرآن کی حرارت سے خالی ہو گئے تو ایسے مردوں سے اچھائی

کی کیا امید ہو سکتی ہے۔

(۱۲) مرد مسلمان نے خودی کو چھوڑ دیا۔ اے خضر! مدد کر کہ پانی سر سے گزر گیا ہے۔

اس بند میں جو بارہ اشعار پر مشتمل ہے، موجودہ دور کے مسلمانوں کی حالتِ زار کا

نقشہ کھینچا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی نمازیں ”لا الہ“ کے سوز سے خالی ہیں اور اس

کے نیاز میں ناز مفقود ہے۔ اس کے صوم و صلوٰۃ میں نور کا اور اس کی کائنات میں جلوے کا

ظہور نہیں۔ وہ مسلمان کہ جس کے لیے صرف اللہ کا نام سرمایہ حیات تھا، اب حبِ دولت اور

خوفِ مرگ کے دام میں اسیر ہے۔ عصرِ حاضر کی صحبت اور دو جھوٹے نبیوں کی جھوٹی تربیت

نے اسے دین سے بیگانہ کر دیا۔ اس کے حج اور جہاد کی حیثیت واجباتِ دین کی نہ رہی۔ اس

کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے صوم و صلوٰۃ کے پیکر بے روح ہو کر رہ گئے اور جب روزے نماز سے

روح رخصت ہوئی تو فرد کی زندگی میں ہمواری اور ملت کی زندگی میں نظم و ضبط باقی نہ رہا۔

چوتھا بند

سجدہ کزوے زمیں لرزیدہ است

بر مرادش مہر مہ گرویدہ است

سنگ اگر گیرد نشانِ آں سجود

در ہوا آشفٹہ گردد ہم چو دود

ایں زماں جز سر بریزی ہیچ نیست

اندرو جز ضعیفِ پیری، ہیچ نیست

آں شکوہ ربی الاعلیٰ کجاست

ایں گناہِ اوست یا تقصیرِ ماست



ہمام بخریصہ جلاوید

ہر کے بر جادہ خود تند رو  
ناقہ ما بے زمام و ہرزہ دو  
صاحب قرآن و بے ذوق طلب  
العجب، ثم العجب، ثم العجب!

مطلب: (۱) وہ سجدہ کہ جس سے زمین لرز اٹھتی تھی، جس کے مدار پر سورج اور چاند گردش کرتے تھے۔

(۲) اس سجدہ کا نشان اگر پتھر خود پر ثبت کر لیتا تھا تو وہ پتھر دھویں کی طرح ہوا میں تحلیل ہو جاتا تھا۔

(۳) وہ سجدہ موجودہ زمانے میں سوائے سر جھکانے کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس میں سوائے بڑھاپے کی کمزوری کے اور کچھ نہیں ہے۔ یعنی نماز مجبوراً، بڑی مصیبت سمجھ کر سجدہ ادا کرتے ہیں۔ اس میں کوئی ذوق و شوق نہیں ہوتا۔

(۴) وہ ربی الاعلیٰ کا دبدبہ کہاں ہے؟ یہ اس کا گناہ ہے یا ہماری تقصیر ہے؟ جب مسلمان سجدے میں ”ربی الاعلیٰ“ کہتا ہے تو اب بھی وہ یہ الفاظ زبان سے ضرور ادا کرتا ہے، لیکن وہ ”اعلیٰ“ رب کے سوا غیر رب کو سمجھتا ہے۔

(۵) ہر کوئی اپنے راستے پر سر پٹ دوڑا جا رہا ہے۔ ہماری اونٹنی بغیر ٹکیل کے ہے اور بے مقصد دوڑی جا رہی ہے۔ یعنی آج مسلمان اللہ کی راہ چھوڑ کر، اپنے بنائے ہوئے راستوں پر، جن کی کوئی منزل نہیں ہے، دوڑے جا رہے ہیں۔

(۶) کتنی عجیب بات ہے کہ مسلمان قرآن رکھتا ہے، لیکن طلب کا ذوق نہیں رکھتا۔ عجب ہے، عجب ہے۔

اس بند میں اقبالؒ عہد حاضر کے مسلمانوں کے سجدے کی بے کیفی کا ذکر کرتے ہوئے سوال کرتے ہیں کہ ہمارے ”ربی الاعلیٰ“ کا شکوہ آخر کہاں گیا اور صاحب قرآن ہوتے



پیام بذریعہ جلیوید

ہوئے مسلمان ذوق و شوق سے خالی کیوں رہ گیا؟

پانچواں بند

گر خدا سازد تڑا صاحب نظر  
روزگارے را کہ می آید نگر  
عقل ہا بے باک و دل ہا بے گداز  
چشم ہا بے شرم و غرق اندر مجاز  
علم و فن، دین و سیاست، عقل و دل  
زوج زوج اندر طواف آب و گل  
آسیا آں مرز و بوم آفتاب  
غیر ہیں، از خوشنشن اندر حجاب  
قلب او بے واردات نو بنو  
حاصلش راکس نگیرد باد و جو  
روزگارش اندریں دیرینہ دیر  
ساکن و بیخ بستہ و بے ذوق سیر  
صید ملایان و غنچیر ملوک  
آہوئے اندیشہ اولنگ و لوک  
عقل و دین و دانش و ناموس و تنگ  
بستہ فتراک لردان فرنگ  
تاختم بر عالم افکار او  
بردردیم پردہ اسرار او  
درمیان سینہ دل خوں کردہ ام  
تا جہانش را دگر گوں کردہ ام





— پیام بذریعہ جاوید —

مطلب: (۱) اگر خدا تجھے صاحبِ نظر بنائے تو جو زمانہ آنے والا ہے، اسے غور سے دیکھنا۔

(۲) یہ آنے والا زمانہ ایسا ہوگا کہ جس میں لوگوں کی عقلیں بے باک اور دل بے گداز ہوں گے، آنکھیں بے شرم و حیا ہوں گی اور مجاز (ہوس) میں غرق ہوں گی۔

(۳) علم و فن، دین و سیاست، عقل و دل، سب کے سب گروہ درگروہ آب و گل کے طواف میں لگے ہوئے ہیں، یعنی ان سب میں مادہ پرستی کا دور دورہ ہے۔ ان کا روح سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ سب تن کے دل دادہ ہیں۔

(۴) ایشیا جو آفتاب کی جنم بھومی ہے، یہاں کے رہنے والے خود سے تو حجاب میں ہیں اور غیروں کا نظارہ کر رہے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے۔ کبھی علوم و فنون بھی مشرق سے نکلتے تھے۔ آج مشرق جہالت کی تاریکی میں ہے، اپنے علوم و فنون سے ناواقف اور یورپ کے علوم و فنون کا شیدائی۔

(۵) ایشیا کا قلب نئی نئی واردات سے خالی ہے۔ اس کے فکر و خیال کو کوئی جو کے دانوں کے عوض بھی خریدنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

(۶) اس پرانی، گھسی پٹی دنیا میں اس کی زندگی ساکن، بے بستی، جامد اور سیر و حرکت کے ذوق کے بغیر ہے۔

(۷) وہ جاہل اور غلط کارِ ملامت اور بادشاہوں (نوابوں، جاگیرداروں اور وڈیروں) کا شکار ہو چکا ہے۔ اس کے فکر کا ہرن لنگڑا اور گھٹنوں کے بل ہاتھ ٹیک کر چلنے والا ہے۔

(۸) اس کی عقل، دین، دانش، ناموس و ننگ، فرنگیوں کے لارڈوں کی فتراک میں (شکار کی طرح) بندھے ہوئے ہیں، یعنی یہ سب کچھ فرنگیوں کے تابع ہیں۔

(۹) میں نے مشرق کے افکار پر چڑھا کی کی اور اس کے پردوں کو چاک کر دیا، یعنی



— پیام بذریعہ جاوید —

میں نے اہل مشرق کی کمزروی کا راز کھول کر بیان کر دیا ہے۔

(۱۰) اہل مشرق کی حالت زار دیکھ کر میں نے اپنے سینے میں دل خون کر لیا ہے، تب

جا کر میں نے ان کی دنیا بدلی ہے۔

اس بند میں اقبالؒ ایک بار پھر نوجوان سے مخاطب ہوتے اور اس سے کہتے ہیں کہ

اللہ تجھے صاحب نظر کرے تو اس دنیا کی ایک جھلک دیکھ جو اس وقت تیرے سامنے ہے۔ ان

دنیا والوں کی عقلیں بے باک ہیں، ان کے دل گداز سے خالی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں شرم

باقی نہیں رہی اور وہ سرتاپا ”مجاز“ میں غرق ہیں۔ اس عہد میں علم و فن، دین و سیاست اور عقل

و دل سب آب و گل کے طواف میں مصروف ہیں۔

چھٹا بند

من بطبع عصر خود گفتم دو حرف

کردہ ام بحرین را اندر دو ظرف

حرف بیچا بیچ و حرف نیش دار

تا کنم عقل و دل مرداں شکار

حرف تہ دارے بانداز فرنگ

نالہ مستانہ از تار چنگ

اصل ایں از ذکر و اصل آں ز فکر

اے تو بادا وارث ایں فکر و ذکر

آبجویم از دو بحر اصل من است

فصل من فصل است و ہم وصل من است

تا مزاج عصر من دیگر فتاد

طبع من ہنگامہ دیگر نہاد



### ہمام بذریعہ جلوید

مطلب: (۱) میں نے اپنے زمانے کی طبیعت کے بارے میں دو باتیں کی ہیں۔  
یوں سمجھو کہ یہ دو باتیں نہیں ہیں، بلکہ دو سمندروں کو دو برتنوں میں بند کر دیا ہے۔

(۲) یہ دو باتیں بیچ دار اور چھتی ہوئی ہیں، تاکہ میں مردوں کی عقل اور دل کو شکار کروں۔ اقبال کہنا یہ چاہتے ہیں کہ میں نے اپنے کلام میں دو قسم کی باتیں کی ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کا تعلق عقل اور ذہن سے ہے، اور دوسری وہ ہیں جن کا تعلق دل اور عشق سے ہے۔ ایک قسم میری باتوں کی فکر کے تحت آتی ہے اور دوسری قسم ذکر کے تحت۔ مثلاً میں نے اپنی کتب ”فلسفہ عجم“ اور ”تفکیر جدید الہیات“ میں جو باتیں کی ہیں، وہ عقل و ادراک اور فلسفہ و حکمت و دانش کا پہلو رکھتی ہیں، اور جو باتیں میں نے اپنے اردو اور فارسی منظوم کلام میں کی ہیں، ان پر عشق و مستی غالب ہے، وہاں عقل و حکمت بھی دل کے تابع ہے۔ اے بیٹے! تو دونوں سے استفادہ کر۔ میں مانتا ہوں، میری ساری کتابوں کا انداز بیچ دار، تہ دار اور نیش دار ہے، لیکن میری اور میرے مخاطبین کی ضرورت یہی تھی کہ میں یہ انداز بیان اختیار کروں۔ بات عشق کی ہو یا عقل کی، عام شاعروں کی طرح سادہ انداز میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لیے مشکل انداز بیان مجبوراً اختیار کرنا پڑتا ہے۔

(۳) میں نے فرنگیوں کی طرح فلسفہ و حکمت کی تہ دار باتیں کی ہیں اور اپنے رباب کے تاروں سے متانہ نالے بھی پیدا کیے ہیں، یعنی مومنانہ اور عاشقانہ انداز بھی اختیار کیا ہے۔ تقاضائے وقت کے مطابق میں نے عشق و عقل کے دونوں اسلوب اختیار کیے ہیں۔ (۴) اس کی یعنی عشق کی اصل ذکر ہے، اور اس کی یعنی عقل کی اصل فکر ہے۔ اے کاش، تُو ان دونوں کا وارث و امین بن جائے۔

(۵) میں ایک ندی ہوں۔ میری اصل (عشق و عقل) کے دو سمندروں سے ہے۔ میری جدائی میری جدائی بھی ہے اور میرا وصل بھی ہے۔ مراد یہ ہے کہ میں نے عشق اور عقل کو ان کے جداگانہ اور منفرد اوصاف کے ساتھ بھی بیان کر دیا ہے اور ان کے باہمی تعلق کی بناء پر بھی۔



پیام بذریعہ جاوید

(۶) چوں کہ میرے زمانے کا مزاج اور طرح کا ہے، اس لیے میری طبع نے بھی ایک اور طرح کا ہنگامہ کیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ پہلے ادوار کے شاعروں نے ان ادوار کے تقاضوں کے مطابق شاعری کی ہے اور میں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق۔ اس وقت ضرورت تھی کہ عقل کی بے راہ روی دکھا کر عشق کی راہ مستقیم دکھائی جاتی، اور محض اس عقل کو اختیار کرنے کے لیے کہا جاتا جو عشق کے تابع ہے۔ جہاں فکر کی بات کی جاتی، وہاں ذکر کی اہمیت بھی بتائی جاتی، اس لیے کہ ذکر بغیر فکر اور فکر بغیر ذکر کے بیکار ہے۔

یہ بند ان تصورات کی تمہید ہے جو اگلے ساتویں بند میں اقبال پیش کرنے والے ہیں۔ یہ ساتواں بند ایک لحاظ سے پوری نظم کا قلب اور روح ہے۔ اس بند میں اقبال نے عہد حاضر کے نوجوان کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور علم کے صحیح مفہوم کی وضاحت کی ہے۔

ساتواں بند:

نوجوان تشنہ لب، خالی ایام  
 شستہ زو، تاریک جاں، روشن دماغ  
 کم نگاہ و بے یقین و نا اُمید  
 چشمِ شاں اندر جہاں چیزے ندید  
 ناکساں منکر زخود مومن بغیر  
 خشت بند از خاکِ شاں معمارِ دیر  
 مکتب از مقصود خویش آگاہ نیست  
 تا بجزب اندرویش راہ نیست  
 نورِ فطرت رازِ جانِ ہا پاک شست  
 یک گل رعنا ز شاخِ او نرسست  
 خشت را معمارِ ما کج می نہد  
 خوئے بط با بچہ شایں دہد



پیام بذریعہ جلیوید

علم تا سوزے نگیرد از حیات  
دل نگیرد لذتے از واردات  
علم جز شرح مقامات تو نیست  
علم جز تفسیر آیات تو نیست  
سوقن می باید اندر ناز حس  
تابدانی نقره خود را زمس  
علم حق اول حواس، آخر حضور  
آخر او می گنجید در شعور

مطلب: (۱) عصر حاضر کے نوجوان تشنہ لب ہیں اور ان کے پیالے خالی ہیں، یعنی ان کو نہ ذکر کا خیال ہے نہ فکر کی اہمیت کا اندازہ، اس لیے ان کے چہرے تو چمک دار، لیکن جانیں تاریک اور دماغ روشن ہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ جسم کی آرائش و تزئین کے تو قائل ہیں، روح کی تجلی کے قائل نہیں۔

(۲) وہ کم نگاہ، بے یقین اور نا اُمید بھی ہیں۔ ان کی آنکھوں نے جہاں میں کوئی چیز نہیں دیکھی، یعنی وہ دنیا کی حقیقت سے آشنا نہ ہو سکے اور ہوتے بھی کیسے، اُن کے پاس وہ نگاہ ہی نہیں ہے۔ اُن کو حقیقت کائنات کا یقین ہی نہیں ہے، وہ زندگی کے مقاصد سے بے خبر ہونے کی بنا پر مایوسانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

(۳) یہ نوجوان ناکس ہیں۔ کسی شمار میں نہیں، کیونکہ وہ اپنی ہستی کا انکار کرتے ہیں اور دوسروں کی ہستی پر ایمان لاتے ہیں۔ یعنی وہ اپنی روایات اور اقدار کو بیچ سمجھتے ہیں اور دوسروں کی روایات اور اقدار کو عزیز جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بُت خانے کا معمار ان کی مٹی سے اینٹیں بناتا ہے اور اپنے بُت خانے پر لگاتا ہے۔

(۴) آج کا وہ کتب، جس میں یہ نوجوان تعلیم پاتے ہیں، اپنے مقصود سے آگاہ نہیں ہے، کیونکہ اس میں آدمی کے اندر جذب ہونے کی راہ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج



پیام بذریعہ جاوید

کا مدرسہ اور آج کا اُستاد ذہن اور بدن کی عمارتیں تو تعمیر کرتا ہے، لیکن روح اور دل کی عمارتیں مسمار کرتا ہے۔ ان مدرسوں کا علم تن کی پرورش کے لیے ہے، من کی پرورش کے لیے نہیں ہے، اور مولانا روم کے الفاظ میں جو علم تن کے لیے پڑھا جاتا ہے، وہ آدمی کو سانپ بن کر ڈس لیتا ہے اور جو علم دل کے لیے پڑھا جاتا ہے، وہ آدمی کا یار بن جاتا ہے۔

(۵) ہمارے ان مدرسوں اور استادوں نے نوجوانوں کی جانوں سے فطرت کے نور کو دھوا ڈالا۔ مدرسے کی شاخ سے ایک شاداب پھول بھی نہیں کھلا، یعنی مردِ حق ایک بھی پیدا نہیں ہوا۔

(۶) ہمارا معمار یعنی مدرسے کا اُستاد پہلی اینٹ ہی نیڑھی رکھتا ہے۔ وہ شاہین بچوں کو بطخ کی عادت ڈالتا ہے۔

(۷) علم جب تک زندگی سے سوز نہیں لیتا، اُس وقت تک دل واردات کی لذت سے آشنا نہیں ہوتا، یعنی علم بے عشق دل کی موت ہے۔

(۸) علم سوائے تیرے (یعنی آدمی کے) مقامات کی شرح کے سوا کچھ نہیں ہے۔ علم سوائے تیری آیات کی تفسیر کے اور کچھ نہیں۔ یہ علم جو عصرِ حاضر نے تجھے دیا ہے، یہ آدمی کو اُس کے مقامات سے نا آشنا کرتا ہے۔ اُسے اُس کے مقصدِ تخلیق سے دور لے جاتا ہے، اس لیے یہ علم درحقیقت جہالت ہے۔ علم تو وہ ہوتا ہے جو تجھے تیری معرفت عطا کرے۔ محض رزق اور تن پروری کے لیے علم حاصل کرنا یہ تو خود کو حیوان بنانا ہے۔ کھانا پینا اور ختم ہو جانا تو حیوانوں کی زندگی ہوتی ہے۔ بیٹے! علم وہ حاصل کر جو تجھے تجھ سے آشنا کر دے۔ تیری مخفی انسانی صلاحیتوں کو اجاگر کرے اور جو تجھے انسان بنائے، بلکہ اس سے بھی آگے کے مقامات سے تجھے آشنا کرے۔

(۹) جس کی آگ میں جلنا چاہیے، تاکہ تُو اپنی چاندی کو تانبے سے الگ پہچان سکے۔ یعنی آدمی کو پہلے وہ علوم حاصل کرنے چاہئیں جو ظاہری حواسِ خمسہ سے حاصل ہوتے ہیں، یعنی علم الاسما کے تحت آفاق کے علم سے آشنا ہونا چاہیے۔ اس کے بعد وہ علوم حاصل



پیام بذریعہ جاوید

کرنے چاہئیں جو باطنی حواسِ خمسہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ تب جا کر کھرے کھوٹے اور انسانِ حیوان کی شناخت ہوگی۔

(۱۰) حق کا علم پہلے حواس سے حاصل کیا جاتا ہے اور آخر میں مشاہدات سے۔ یہ علم جو آخر میں آتا ہے، حضوری پیدا کرتا ہے۔ حضوری ایسی چیز ہے جو عقل کی گرفت میں نہیں آسکتی۔ مراد یہ ہے کہ علم حق کی ابتدا بے شک شعور سے ہوتی ہے، لیکن اس کی انتہا کا شعور کسی کے علم میں نہیں۔ اسے صرف کوئی مردِ حق ہی جان سکتا ہے۔

اس بند کے پہلے دو شعروں میں اقبال نے عہدِ حاضر کے نوجوان کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے کہ تشنہ لب، خالی ایام، شستہ زو، تاریک جان، روشن دماغ، کم نگاہ، بے یقین اور نا اُمید۔ ان خامیوں کا ذمہ دار تعلیم کو ٹھیراتے ہوئے اپنی بات تمثیل اور کنایے کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آج کل کی تعلیم اپنے مقصود سے آگاہ نہیں اور اس کی لے نے طالب علم کے جذبِ اندروں تک رسائی حاصل نہیں کی۔ اس کی شاخوں میں گلِ رعنا اگانے کی صلاحیت نہیں اور اس نے شاہین بچوں میں بطخوں کی عادت پیدا کر دی ہے۔ علم جب تک زندگی سے سوز حاصل نہ کرے، دل کو واردات (قلبی) میں کوئی لذت حاصل نہیں ہوتی۔ آج کا علم سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ تیرے مقام و مرتبے کی تشریح اور تیری آیاتِ ذات کی تفسیر کرے۔ انسان کو پہلے احساس کی آگ میں جلنا ہوتا ہے، جب وہ اس قابل بنتا ہے کہ اپنی ذات کے کھوٹے کھرے میں امتیاز کر سکے۔

علم حق اوّل حواس آخر حضور  
آخر او می گنجید در شعور!

آٹھواں بند

صد کتاب آموزی از اہل ہنر  
خوشتر آں در سے کہ گیری از نظر



پیام ہذریعہ جلاوید

ہر کسے زان می کہ ریزد از نظر  
 مست می گردد باندازِ دگر  
 از دم بادِ سحر میرد چراغ  
 لالہ زان بادِ سحرے در ایام  
 کم خور و کم خواب و کم گفتار باش  
 گردِ خود گردندہ چوں پُر کار باش  
 منکرِ حق نزدِ مُلّا کافر است  
 منکرِ خود نزدِ من کافر تر است  
 آن بانکارِ وجود آمد، عجول  
 ایں عجول و ہم ظلوم و ہم جہول  
 شیوہٴ اخلاص را محکم بگیر  
 پاک شو از خوفِ سلطان و امیر  
 عدل در قہر و رضا از کفِ مدہ  
 قصد در فقر و غنا از کفِ مدہ  
 حکم دشوار است؟ تاویلے مجو  
 جز بقلبِ خویش قندیلے مجو  
 حفظِ جاں با ذکر و فکر بے حساب  
 حفظِ تن با ضبطِ نفس اندر شباب  
 حاکی در عالمِ بالا و پست  
 جز بحفظِ جان و تن ناید بدست  
 لذتِ سیر است مقصودِ سفر  
 گر گنہ بر آشیان داری پیر





پیام بذریعہ جلوبید

ماہ گردد تا شود صاحب مقام  
سیر آدم را مقام آمد حرام  
زندگی جز لذت پرواز نیست  
آشیاں با فطرت او ساز نیست  
رزق زاغ و کرگس اندر خاک گور  
رزق بازاں در سوادِ ماہ و ہور

مطلب (۱) اگر کثرتِ اہلِ بُنر سے سوکتا میں بھی پڑھے، تو اس سے وہ ایک درس بہتر ہے جو تو کسی مردِ کامل سے حاصل کرے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اولیا کی صحبت کا ایک لمحہ صد سالہ بے ریا طاعت سے بہتر ہوتا ہے۔

(۲) ہر شخص اُس شراب سے، جو نظر سے ٹپکتی ہے، اپنے اپنے انداز سے مست ہوتا ہے، یعنی ہر شخص اپنی طلب اور ظرف کے مطابق اس سے فیض یاب ہوتا ہے۔

(۳) (پچھلے شعر کے مفہوم کو آگے بڑھاتے ہوئے) اقبال کہتے ہیں کہ صبح کی ہوا کے جھونکے سے چراغ بجھ جاتا ہے۔ اسی جھونکے سے لالے کے پھول کے پیالے میں شراب آجاتی ہے، یعنی وہ سرخ و شاداب ہو جاتا ہے۔ چراغ کو موت اور لالے کو زندگی نصیب ہوتی ہے، حالاں کہ جھونکا ایک ہی ہے۔

(۴) اے بیٹے! کم کھاؤ، کم بولو اور کم سوؤ اور اپنے گرد پرکار کی طرح گھومو۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی ذات کا طواف کر، غیروں کا دست نگر نہ ہو۔ اپنی معرفت حاصل کرنے میں کوشاں رہ، کھانا، سونا اور باتیں کرنے ہی کو زندگی نہ بنالے۔ ان تین چیزوں سے بے تعلقی تجھے تیری خودی کی معرفت اور اس کے استحکام میں مددگار ثابت ہوگی۔

(۵) اللہ کا منکر ملا کے نزدیک کافر ہے، لیکن میرے نزدیک اپنی ذات کا منکر بڑا کافر ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تو پوشیدہ ہے لیکن تُو خود تو ظاہر ہے۔ ظاہر کا انکار کرنا اور غیب کی جستجو کرنا یہ کہاں کی دانش مندی ہے۔ پہلے خود کو تلاش کر، جب تُو اپنی تلاش کر لے گا تو اللہ مل



پیام بذریعہ جاوید

جائے گا۔ ملا اللہ کو اپنے سے باہر ڈھونڈتا ہے، جبکہ اللہ اس کے اندر ہے۔ اس کی شرگ سے قریب ہے، اس کے دل میں ہے۔ جس نے خود کو تلاش کر لیا، گویا اس نے اپنے رب کو پا لیا۔ علامہ اقبال نے اسے لیے بار بار کہا ہے کہ خدا کو تلاش کرتے ہو۔ اپنے قریب جاؤ۔ یہ بات حضرت علیؓ کے اس مشہور مقولے پر مبنی ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

(۶) وہ یعنی منکر حق اللہ کے وجود کے انکار کی وجہ سے عجز (جلد باز) ہے کہ اس نے بلا سوچے سمجھے، تحقیق و تفتیش کے بغیر، محض جلد بازی سے اس کے وجود سے انکار کر دیا۔ منکر عجز کے علاوہ ظلم اور جہول بھی ہے۔ ظلم اس لیے کہ اس نے اپنا انکار کر کے خود پر ظلم کیا اور اپنی مٹنی صلاحیتوں سے بے خبر رہ کر خود سے جاہل رہا۔

(۷) اخلاص کا شیوہ سختی سے اختیار کر، اور اس طرح سلطان اور امیر کے خوف سے آزاد ہو جا۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کا دامن خلوص سے تھام لے۔ اس طرح تو غیر اللہ سے بے نیاز ہو جائے گا۔

(۸) ٹوٹیش میں ہو یا خوشنودی کی حالت میں ہو، دونوں حالتوں میں عدل کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ مفلسی ہو یا امیری، میانہ روی کو نہ چھوڑ۔

(۹) اگر اللہ کا کوئی حکم دشوار ہے تو اس کی تاویل نہ ڈھونڈ۔ کسی مشکل کشا سے اس کا حل ڈھونڈ۔ اپنے معنی پیدا نہ کر۔ اپنے قلب کے سوا کہیں اور سے چراغ نہ ڈھونڈ۔

(۱۰) روح کی حفاظت اللہ کے بے حد و حساب ذکر کرنے میں ہے، اور جسم کی حفاظت جوانی میں ضبط نفس سے ہے۔

(۱۱) عالم بالا و پست (دنیا اور آخرت میں) سرفرازی ہاتھ نہیں آتی، سوائے جان و تن کی حفاظت کے۔

(۱۲) سفر کا مقصد سیر کی لذت ہے۔ اگر ٹوٹاشیاں ہی رکھے ہوئے ہے تو پھر نہ اڑ۔



پیام بذریعہ جاوید

مقصد یہ ہے کہ ترقی کے حصول کے لیے بہت سی آسانشوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کٹو روحانی ترقی چاہتا ہے تو تجھے دنیا کے علائق سے الگ ہونا پڑے گا۔ یاد رکھ، اس سفر میں جو لذت تجھے نصیب ہوگی، وہ دنیا کی لذتوں سے بڑھ کر ہوگی۔ پرواز کی لذت آشیانے کے سکون کی لذت سے کہیں اعلیٰ وارفع ہوتی ہے۔ سکون چھوڑ، حرکت اختیار کر۔ تن کا آرام چھوڑ اور روح کی بالیدگی کے اسباب پیدا کر۔

(۱۳) چاند اس لیے گردش کرتا ہے کہ وہ صاحب مقام ہو جائے یعنی چودھویں کی رات تک مکمل ہو جائے۔ اس کے بعد اس کا سطر ارتقا ختم ہو جاتا ہے، لیکن آدمی کے لیے مقام کرنا حرام ہے، وہ تو ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ اس کے ارتقا کی کوئی حد نہیں۔

(۱۴) زندگی پرواز کی لذت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آشیانہ اس کی فطرت کو اس نہیں آتا۔

(۱۵) کوئے اور گدھ کا رزق قبر کی مٹی میں ہے۔ وہ مردہ لاشوں کا گوشت کھاتے ہیں۔ بازو (شاپینوں) کا رزق چاند اور سورج کے نواح میں ہے۔ وہ بلند پرواز کرتے ہوئے فضا میں زندوں کا شکار کرتے ہیں۔

یہ بند پچھلے بند کے افکار و خیالات کا تکملہ ہے۔ اس کا ایک ایک شعر مفہوم اور مزاج کے اعتبار سے ایسا ہے کہ ضرب المثل بن کر زبان و قلب کا وظیفہ بنے۔ چوتھا شعر ”کم کھاؤ، کم سوؤ، کم بولو“ علامہ اقبال کو ایک خاص موقع پر یاد آیا۔ وہ ۶ نومبر ۱۹۳۱ء کو لندن میں ”اقبال لٹریچر ایسوسی ایشن“ کی ایک تقریب میں تقریر کر رہے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ ”۱۹۰۵ء میں، جب میں انگلستان آیا تھا تو میں محسوس کر چکا تھا کہ مغربی ادبیات اپنی ظاہری دل فریبی اور دلکشی کے باوجود اس روح سے خالی ہیں جو انسانوں کے لیے اُمید، ہمت اور جراتِ عمل کا پیغام ہوتی ہے اور جسے زندگی کے جوش اور ولولے سے تعبیر کرنا چاہیے۔“



پیامِ بذریعہ جلوسید

آگے چل کر اقبال کہتے ہیں: ”اگرچہ میرے ساتھ کوئی فوج نہیں ہے، تاہم رفقاء کی ایک کثیر جماعت میرے سامنے ہے۔ آپ اپنی تعداد کو بڑھائیے۔ میں آپ کو وہی نصیحت کرتا ہوں جو میں نے اپنے فرزند کو کی ہے، یعنی۔

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش

گردِ خود گردندہ پٹوں پر کار باش

”کم کھاؤ، کم سوؤ، کم بولو“ یہ دراصل خواجہ نظام الدین اولیا کا قول ہے، اور یہ مصرع

ہو بہو اس قول کا فارسی ترجمہ ہے۔

اس بند کے چھ شعر میں دونوں مصرعوں میں قرآنی آیات کے حوالے ہیں۔ پہلا

مصرع سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۱۱ کی طرف اشارہ ہے:

وَيَذُحُ الْإِنْسَانَ بِالْشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا

(انسان شر اس طرح مانگتا ہے جس طرح خیر مانگتی چاہیے۔ اور انسان بڑا ہی جلد باز

واقع ہوا ہے)

دوسرا مصرع سورہ احزاب کی آیت ۲ کی طرف اشارہ ہے:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا

وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا

(ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا تو وہ اسے

اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اس سے ڈر گئے، مگر انسان نے اسے اٹھالیا۔ بے شک وہ

بڑا ظالم اور جاہل ہے)

نواں بند

سزِ دین، صدقِ مقال، اکلِ حلال

خلوت و جلوت، تماشائے جمال



..... پیام ہنرِ بصرہ جاوید .....

در رو دیں سخت چوں الماس زی  
 دل بکن بر بند و بے وسواس زی  
 سرے از اسرار دیں بر گویت  
 داستانے از مظفر گویت  
 اندر اخلاص عمل فرد فرید  
 پادشاہے بامقام بایزید  
 پیش او اسے چو فرزنداں عزیز  
 سخت کوش چوں صاحب خود درستیز  
 سبزہ رنگے از نصیبانے مس  
 بادقا، بے عیب، پاک اندر نسب  
 مرد مومن را عزیز اے نکتہ رس  
 چیست مجر قرآن ششیر و فرس؟  
 من چہ گویم وصف آں خیر الجیاد  
 کوہ و روئے آبہا رفتے چو باد  
 روزی بیجا از نظر آمادہ تر  
 تند بادے طائف کوہ و کمر!  
 در تگ او فتنہ ہائے رستیز  
 سنگ از ضرب سُم او ریز ریز  
 روزے آں حیواں چو انساں ارجمند  
 گشت از درد شکم زار و نژند  
 کرد بیطارے علائش از شراب



پیام ہدایہ جلیب

اسب شہ را وارہاند از چچ و تاب  
شاہ حق میں دیگر آں کیراں نخواست  
شرع تقویٰ از طریق ما جد است  
اے ترا بخشد خدا قلب و جگر  
طاعتِ مردِ مسلمانے نگر!

مطلب (۱) دین کا راز چچ بولنے اور حلال کھانے میں ہے۔ خلوت ہو یا جلوت، دونوں جگہ جمالِ خداوندی کا تماشا کرنے میں ہے۔ ظاہر ہے، جب خدا کا جلوہ ہر جگہ نظر آئے گا تو کج فکری اور کج عملی اختیار ہی نہیں کی جاسکتی۔ کوئی دیکھ رہا ہو تو چوری کون کرتا ہے۔

(۲) دین کی راہ میں الماس کی طرح سختی کے ساتھ جی۔ حق کے ساتھ دل لگا اور شک و دوسواس کے بغیر جی۔ مراد یہ ہے کہ دین کی راہ پر اس طرح ثابت قدمی سے چل کہ کوئی چیز بھی تیری راہ میں رکاوٹ نہ بن سکے اور تیرے پاؤں کو لغزش نہ دلا سکے۔

(۳) بیٹے! میں تجھے اسرارِ دین میں سے ایک سِر (بھید) بتاتا ہوں۔ اس کی وضاحت کے لیے میں تمہیں مظفر بادشاہ کی ایک حکایت بیان کرتا ہوں (سلطان مظفر پندرھویں صدی عیسوی میں گجرات، مشرقی ہند، کے علاقے کا ایک طاقتور، بہادر اور دین دار بادشاہ تھا)

(۴) وہ عمل کے اخلاص میں ایک بے مثل شخص تھا۔ وہ بائزید بستانی جیسے مرد فقیر کا سامرتہ رکھنے والا شخص تھا۔

(۵) اس کے پاس ایک گھوڑا تھا جو اسے بیٹوں کی طرح عزیز تھا۔ وہ جنگ کے موقع پر اپنے مالک کی طرح سخت کوشش تھا۔

(۶) وہ گھوڑا نسل کا سبزہ رنگ، اور عرب کے اصیل گھوڑوں میں سے تھا۔ وہ با وفا، بے عیب اور نسب میں پاک تھا۔



پیام بذریعہ جاوید

(۷) اے نکتہ رس بیٹے! مرد مومن کے لیے قرآن، تلوار اور گھوڑے سے بڑھ کر اور کیا چیز عزیز ہو سکتی ہے۔

(۸) میں اس شریف و اصیل اور بہترین گھوڑے کے اوصاف کے متعلق کیا کہوں۔ وہ پہاڑوں اور دریاؤں سے ہوا کی طرح گزر جاتا تھا۔

(۹) وہ جنگ کے دن نظر سے بھی زیادہ تیز تھا، اور تیز ہوا کی طرح پہاڑوں اور گھاٹیوں کو عبور کر لیتا تھا۔

(۱۰) اُس کی دوڑ میں قیامت کے فتنے تھے۔ اُس کے سُم کی ضرب سے پتھر ریزہ ریزہ ہو جاتے تھے۔

(۱۱) ایک روز وہ گھوڑا، جو انسان کی طرح ارجمند تھا، پیٹ کے درد کی وجہ سے کمزور اور تڑھال ہو گیا۔

(۱۲) ایک جانوروں کے معالج نے اُس کا علاج شراب سے کیا، اور اس طرح اُس نے بادشاہ کے عزیز گھوڑے کو درد کے پیچ و تاب سے نجات دلائی۔

(۱۳) خدا شناس بادشاہ نے پھر کبھی اس گھوڑے کو سواری کے لیے طلب نہ کیا۔ بے شک تقویٰ کا راستہ ہمارے راستے سے جدا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چوں کہ گھوڑے نے شراب پی لی تھی، اس لیے بادشاہ نے اس پر سوار ہونے کو بھی حق پرستی کے خلاف سمجھا۔

(۱۴) خدا تجھے قلب و نظر عطا کرے۔ ایک مسلمان کی اطاعت کا یہ رنگ دیکھ، کہ اُس نے اُس گھوڑے پر بھی سوار ہونا گوارا نہ کیا، جس نے شراب پی لی تھی۔

دسواں بند

ویر سراپا سوختن اندر طلب  
انتہائش عشق و آغازش ادب  
آبروئے گل زرنگ و بوئے دوست  
بے ادب بے رنگ و بو، بے آبرو دوست



— پیام بذریعہ جاوید —

نوجوانے را چوینم بے ادب  
 روز من تاریک می گردد چو شب  
 تاب و تب در سینہ افزاید مرا  
 یاد عہد مصطفیٰ آید مرا  
 از زمان خود پشیاں می شوم  
 در قرون رفتہ پنہاں می شوم  
 ستر زن یا زوج یا خاک لحد  
 ستر مرداں حفظِ خویش از یار بد  
 حرف بد را بر لب آوردن خطا ست  
 کافر و مومن ہمہ خلقِ خدا ست  
 آدمیت احترامِ آدمی  
 باخبر شو از مقامِ آدمی  
 آدمی از ربط و ضبط تن بہ تن  
 بر طریق دوستی گامے بزن  
 بندہ عشق از خدا گیرد طریق  
 می شود بر کافر و مومن شفیق  
 کفر و دیں را گیر در پہنائے دل  
 دل اگر بگریزد از دل، وائے دل  
 گرچہ دل زندانی آب و گل است  
 ایں ہمہ آفاق، آفاقِ دل است

مطلب (۱) بیٹے، بتاؤں، دین کیا ہے۔ دین اللہ کی طلب میں خود کو جلانا ہے۔ اس





— پیام ہدیرہ جلیوید —

کی انتہا عشق ہے اور اس کا آغاز ادب ہے۔

(۲) دیکھو، پھول کی آبرو اس کے رنگ اور خوش بو سے ہے۔ بے ادب بے رنگ دیو اور بے آبرو ہوتا ہے۔

(۳) میں جب کسی نوجوان کو بے ادب دیکھتا ہوں تو میرا دن میری رات کی طرح تاریک ہو جاتا ہے۔

(۴) میرے سینے کا اضطراب بڑھ جاتا ہے اور نبی کریمؐ کا دور یاد آ جاتا ہے۔

(۵) میں اپنے زمانے پر پچھتا تا ہوں کہ ایسے زمانے میں پیدا ہوا جو بے ادب لوگوں کا زمانہ ہے۔ میں خود کو پرانی صدیوں میں چھپا لیتا ہوں، یعنی پرانے با ادب زمانے کی یاد میں کھو جاتا ہوں۔

(۶) عورت کا ستر اس کا خاندان ہے یا اس کی قبر۔ مرد کا ستر خود کو برے دوستوں کی صحبت سے بچانا ہے۔

(۷) بری بات کو ہونٹوں پر لانا خطا ہے۔ کافر اور مومن سب اللہ کے پیدا کردہ ہیں۔ سب سے محبت کا برتاؤ کرنا چاہیے۔

(۸) آدمیت آدمی کے احترام کا نام ہے۔ تجھے آدمی کے مقام سے باخبر ہونا چاہیے۔

(۹) آدمی تن بہ تن کے ربط سے ہے، یعنی ایک آدمی کے دوسرے آدمی کے ساتھ جو تعلقات ہوتے ہیں، آدمیت اس کا نام ہے۔

(۱۰) بندہ عشق خدا سے مسلک (زندگی) لیتا ہے، یعنی جس طرح خدا سب پر مہربان ہے، اسی طرح بندہ عشق بھی کافر اور مومن دونوں پر مہربان ہوتا ہے۔

(۱۱) کفر اور دین کو دل کی وسعت میں رکھ۔ ایک دل اگر دوسرے دل سے بھاگے تو ایسے دل پر افسوس ہے۔ یعنی قلب میں اتنی وسعت پیدا کر کہ وہ سب سے محبت کرے۔



پیام بذریعہ جلوید

(۱۲) اگرچہ دل آب و گل (جسم) کے قید خانے میں ہے، مگر یہ ساری کائنات دل ہی کی کائنات ہے یعنی دل بہت وسیع ہے۔ اس کو دوسروں سے نفرت کر کے تنگ نہ بنا۔ اس بند میں آدمی اور آدمی کے ربط و ضبط اور دوستی و شفقت کے متعلق جو باتیں کہی گئی ہیں، وہ اس قابل ہیں کہ انھیں حرز جاں بنا کر قدم قدم پر ان سے راہ نمائی حاصل کی جائے۔ اقبال کہتے ہیں کہ تو انسان ہے، اس لیے ربط و ضبط اور باہمی تعلق کا آئین اختیار کر کے دوستی کے راستے پر چل۔ عشق کے بندے اللہ کے راستے پر چلتے اور اپنی شفقت و محبت میں کافرو مومن کو یکساں حصہ دار بناتے ہیں۔ اس لیے اے فرزند! کفر اور دین، دونوں کو اپنے قلب کشادہ میں جگہ دے، اس لیے کہ اے جان پدرا! دل اگر دل سے بھاگے تو وہ ہرگز دل نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ دل آب و گل کا زندانی ہے، لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ سارا جہان دل کا جہان ہے۔

گیارہواں بند

گر چہ باشی از خداوندانِ دہ  
فقر را از کف مدہ، از کف مدہ  
سوئی او خوابیدہ در جان تو ہست  
ایں کہن سے از نیاگان تو ہست  
در جہاں جز دردِ دل ساماںِ خواہ  
نعمت از حق خواہ و از سلطانِ خواہ  
اے بسا مردِ حق اندیش و بصیر  
می شود از کثرتِ نعمتِ ضریر  
کثرتِ نعمتِ گداز از دل برد  
ناز می آرد نیاز از دل برد



— پیام ہدیہ جلوبید —

سالہا اندر جہاں گردیدہ ام  
نم بخشیم منعمان کم دیدہ ام  
من فدائے آنکہ درویشانہ زیست  
وائے آں کو از خدا بیگانہ زیست

مطلب (۱) اگرچہ تو گاؤں کا مالک کیوں نہ ہو۔ فقر کو ہاتھ سے نہ دے، ہاتھ سے نہ

دے۔

(۲) اس کا یعنی فقر کا سوز تیری جان میں سویا ہوا ہے، یعنی تیرے اندر موجود ہے۔  
یہ وہ پرانی شراب ہے جو تجھے تیرے بزرگوں نے عطا کی ہے۔ تیرے بڑے بھی سوز فقر رکھتے  
تھے۔ وہ سوز فقر تجھ میں بھی ہے۔

(۳) جہاں میں درد دل کے سوا کسی اور سامان کی خواہش نہ کر۔ تو جو بھی نعمت  
چاہتا ہے خدا سے مانگ، سلطان سے نہ مانگ۔ درد دل سے مراد ہے، مخلوق کے دکھوں میں  
شریک ہونے والا دل۔

(۴) بسا اوقات حق اندیش اور حق شناس لوگ نعمتوں کی کثرت کی وجہ سے اندھے  
ہو جاتے ہیں اور حق و ناحق میں تمیز نہیں کرتے۔

(۵) نعمتوں کی کثرت دل سے گداز لے جاتی ہے۔ وہ ناز لے آتی ہے اور نیاز  
لے جاتی ہے۔

(۶) میں برسوں دنیا میں گھوما پھرا ہوں۔ میں نے دولت مندوں کی آنکھ میں نم نہیں  
دیکھا۔

(۷) میں اس شخص کے قربان جس نے درویشانہ زندگی بسر کی۔ افسوس ہے اس  
شخص پر جو زندگی میں خدا سے غافل رہا۔



— پیام بذریعہ جاوید —

بار ہواں بند

در مسلماناں مجو آں ذوق و شوق  
 آں یقین، آں رنگ و بو، آں ذوق و شوق  
 عالماں از علم قرآن بے نیاز  
 صوفیاں دژندہ گرگ و مو دراز  
 گرچہ اندر خانقاہاں ہائے و ہوست  
 کو جواں مردے کہ صہبا درکدوست  
 ہم مسلمانانِ افرنگی تاب  
 چشمہ کوثر بجویند از سراب  
 بے خبر از سردین اند این ہمہ  
 اہل کیس اند اہل کیس اند این ہمہ  
 خیر و خوبی بر خواص آمد حرام  
 دیدہ ام صدق و صفا را در عوام  
 اہل دیں را باز داں از اہل کیس  
 ہم نشین حق بجو با او نشین  
 کر گساں را رسم و آئین دیگر است  
 سطوت پرواز شاہیں دیگر است

- مطلب (۱) آج کے دور میں مسلمانوں میں وہ ذوق و شوق تلاش نہ کر۔ وہ یقین، وہ رنگ و بو، اور وہ ذوق و شوق ان میں تلاش نہ کر، جو کبھی ان کے آباؤ اجداد میں تھا۔
- (۲) آج کے علمائے دین قرآن کے علم سے بے نیاز ہیں اور صوفی بھیڑیے اور لے لے بالوں والے ہیں۔ نہ علما میں علم دین کی روح ہے اور نہ صوفیوں میں تصوف باقی



پیام بذریعہ جاوید

ہے۔

(۳) آج اگر چہ درویشیوں کی خانقاہوں میں ہائے وہو کا شور ہے، لیکن ایسا جواں مرد صوفی کہاں ہے کہ جس کے منکے میں تصوف کی شراب ہو۔ سب خالی خالی نعرے لگاتے ہیں۔  
(۴) مسلمان افریقیوں سے متاثر ہیں۔ سراب میں سے چشمہ کوثر ڈھونڈتے ہیں۔  
یعنی تقلید تو کافروں کی کر رہے ہیں اور توقع اسلامی فوائد کی کر رہے ہیں۔  
(۵) یہ سب دین کے بھید سے بے خبر ہیں۔ یہ سب باہمی عداوت رکھنے والے یعنی اہل کینہ ہیں۔

(۶) مسلمانوں کے جو خواص ہیں، سوان میں کوئی خیر و خوبی نظر نہیں آتی۔ البتہ میں نے ان کے عوام میں ابھی تک صدق و صفا کو ضرور دیکھا ہے۔  
(۷) اہل دین کو اہل کینہ سے الگ رکھ۔ دونوں میں فرق کر۔ کسی حق کے ہم نشین کی تلاش کر اور اس کے ساتھ بیٹھ۔ اس کی صحبت اختیار کر۔  
(۸) گدھوں کی رسم و دستور ہے۔ شاہینوں کی پرواز کی ہیبت اور ہے۔ دنیا کے طالب گدھ ہیں اور خدا کے طالب شاہین ہیں۔ گدھوں کو چھوڑ کر شاہینوں کی صحبت اختیار کر۔  
تیرھواں بند

مرد حق از آسماں اُفتد چو برق  
ہیزم اُو شہر و دشت، غرب و شرق  
ما ہنوز اندر ظلام کائنات  
اُو شریکِ اہتمام کائنات  
اُو کلیم " و اُو مسیح " و اُو خلیل  
اُو محمدؐ، اُو کتاب، اُو جبریل  
آفتاب کائنات اہل دل



— پیام ہدیہ جاوید —

از شعاعِ اُو، حیاتِ اہلِ دل  
 اوّل اندر، تارِ خود سوزد ترا  
 بازِ سلطانی بیا سوزد ترا  
 ما ہمہ با سوزِ اُو صاحبِ دلیم  
 ورنہ نقشِ باطلِ آب و گلیم  
 ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دریاں  
 در بدنِ عُرقِ است و کم داند زجاں  
 چون بدن از قحطِ جاں ارزاں شود  
 مردِ حق در خویشتن پنهان شود  
 در نیابد جستجو آں مرد را  
 گرچہ بیند رُو برو آں مرد را  
 تو مگر ذوقِ طلب از کفِ مدہ  
 گرچہ در کارِ تو اُفتد صد گرہ  
 گر نیابی صحبتِ مردِ خیر  
 از آب و جدِ آنچہ من دارم بگیر  
 پیرِ رومی را رفیقِ راہ ساز  
 تا خدا بخشد ترا سوز و گداز  
 زانکہ رومی مغزِ را داند زپوست  
 پائے او محکم فتد در کوئے دوست  
 شرحِ او کردندو اُو را کس ندید  
 معنیِ او چون غزال از مارمید



پیام ہذریعہ جاوید

رقصِ تن از حرف او آموختند  
چشم را از رقصِ جاں بردوختند  
رقصِ تن در گردشِ آرد خاک را  
رقصِ جاں بر ہم زند افلاک را  
علم و حکم از رقصِ جاں آید بدست  
ہم زمیں ہم آسماں آید بدست  
فرد ازوئے صاحبِ جذبِ کلیم  
ملت ازوئے وارثِ ملکِ عظیم  
رقصِ جاں آموختنِ کارے بود  
غیر حق را سوختنِ کارے بود  
تا زناہِ حرص و غم سوزد جگر  
جاں برقص اندر نیاید اے پسر  
ضعفِ ایمان است و دلگیری است غم  
نوجوانا! نیمہ پیری است غم  
می شناسی؟ حرص فقرِ حاضر، است  
من غلامِ آنکہ، بر خود قاہر است  
اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب  
تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب  
سرِ دینِ مصطفیٰ گویم ترا  
ہم بہ قبر اندر دُعا گویم ترا

مطلب (۱) اگر کوئی مرد حق ہو تو اُس کی شان یہ ہے کہ وہ آسماں سے بجلی کی طرح



— پیام بذریعہ جلیوید —

گرتا ہے۔ اس کا ایندھن شہر، بیابان اور مشرق و مغرب کی ہر چیز ہوتی ہے (مردِ حق جب اللہ کی طرف سے دنیا پر مبعوث ہوتا ہے تو وہ باطل کے ایندھن کو اسی طرح جلا دیتا ہے جس طرح بجلی خرمن کو جلا دیتی ہے۔)

(۲) ہم ابھی تک کائنات کے اندھیروں میں ہیں، اور وہ یعنی مردِ حق کائنات کے انتظام میں شامل و مشغول ہے۔

(۳) وہ مردِ حق ہی ظلیل ہے، مسیح ہے، کلیم ہے۔ وہ محمدؐ ہیں۔ وہ کتاب ہے۔ وہ جبریل ہے۔

(۴) وہ اہلِ دل کی کائنات کا آفتاب ہے۔ اُس کی شعاعوں سے اہلِ دل کی حیات ہے۔

(۵) وہ یعنی مردِ حق پہلے تجھے اپنی آگ میں جلاتا ہے۔ پھر تجھے سلطانی سکھاتا ہے۔

(۶) ہم سب اُسی کے سوز سے صاحبِ دل ہیں، ورنہ ہم آبِ دگل (مادہ) کے باطل نقش ہیں۔ (مردِ حق کی صحبت سے آدمی دل والا یعنی صحیح آدمی بنتا ہے، ورنہ وہ محض مٹی کا ایک مجسمہ ہے جو چل پھر رہا ہے۔)

(۷) میں اُس زمانے سے ڈرتا ہوں کہ تو جس میں پیدا ہوا ہے، کیونکہ یہ زمانہ بدن میں غرق ہے اور نہیں جانتا کہ جان کیا ہے۔ تن پرستی کا زمانہ ہے۔ لوگ روح کو بھولے ہوئے ہیں۔ شکم پیش نظر ہے، دل پر دھیان نہیں۔

(۸) جب روح کے قحط سے بدن سستا ہو جاتا ہے تو مردِ حق خود میں چھپ جاتا ہے، یعنی وہ موجود تو ہوتا ہے لیکن لوگوں کی مادہ پرستانہ نگاہیں اسے دیکھ نہیں سکتیں۔ اسے تلاش کرنا پڑتا ہے۔

(۹) ایسے زمانے میں تاش و جستجو بھی اس مردِ حق کو نہیں پاسکتی، اگرچہ وہ اسے رُوبِ رُود





پیام بذریعہ جاوید

کیوں نہ دیکھ رہی ہو (یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اس کی پہچان نہیں ہوتی۔)

(۱۰) لیکن اے فرزند! تو ذوق طلب کو ہاتھ سے نہ دے، خواہ تیری راہ میں سو مشکلات کیوں نہ آئیں۔

(۱۱) اگر تو کسی مردِ خیر (خبر رکھنے والے) کی صحبت نہیں پاتا، تو جو کچھ میں نے اپنے آباؤ اجداد سے لیا ہے، تو وہ لے لے، وہ بھی تیرے لیے مردِ خیر کی صحبت کا کام دے گا۔

(۱۲) پیرِ رومی کو راستے کا رفیق بنا لے، تاکہ خدا تجھے عشق کا سوز و گداز عطا کرے۔

(۱۳) کیوں کہ رومی وہ مردِ حق ہے جو مغز کو چھلکے سے الگ کرتا ہے۔ اس کا پاؤں دوست کی گلی میں مضبوطی سے پڑتا ہے۔ وہ محرمِ اسرارِ دوست ہے۔ وہ حق و باطل کی تمیز جانتا ہے۔

(۱۴) لوگوں نے مولانا رومی کی مثنوی کی شرح لکھی، لیکن رومی کو نہ دیکھا، یعنی اس کا راز نہ پایا، اس کا فقر کیا تھا اور اس سے فیض کس طرح حاصل کرنا چاہیے۔ اس کے معنی ہم سے یوں بھاگے ہیں جیسے کہ ہم سے ہرن بھاگتا ہے۔

(۱۵) ہم نے اس کے کلام سے تن کا رقص سیکھ لیا اور آنکھوں کو جان کے رقص سے سی لیا، یعنی بند رکھا۔

(۱۶) تن کا رقص مٹی (جسم) کو گردش میں لاتا ہے۔ جان کا رقص افلاک کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔

(۱۷) روح کے رقص سے علم اور حکمت ہاتھ آتی ہے۔ زمین اور آسمان بھی ہاتھ آتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ روح کے رقص سے صاحبِ رقص زمان و مکان پر حاوی ہو جاتا ہے۔

(۱۸) روح کے رقص سے صاحبِ رقص حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا جذب حاصل کر لیتا ہے۔ ملت اس سے ایک عظیم ملک کی وارث بن جاتی ہے، کیوں کہ اس رقص سے اس میں



ہمام بذریعہ جلیوید

نبوت کے فیوض آ جاتے ہیں۔

(۱۹) روح کا رقص سیکھنا آسان نہیں ہے، غیر حق کو جلانا آسان نہیں ہے۔

(۲۰) جب تک آدمی کا جگر حرص اور غم کی آگ میں جلتا رہے گا، اے فرزند! روح

رقص میں نہیں آئے گی۔

(۲۱) غم دل گیری ہے، ایمان کی کمزوری ہے۔ اے فرزند! جوان! غم آدھا بڑھاپا

ہے۔

(۲۲) کیا تو جانتا ہے کہ حرص عہد حاضر کا فقر ہے۔ میں تو اس کا غلام ہوں جو خود پر

قادر ہے، یعنی جو اپنے حرص پر قابو پالیتا ہے۔

(۲۳) اے میری بے قرار جان کی تسکین، اے میرے بیٹے! تو اگر روح کے رقص

سے نصیب حاصل کر لے۔

(۲۴) تو پھر میں تجھے مصطفیٰ کا راز بتاؤں گا۔ میں قبر کے اندر بھی تیرے لیے

دعا گور ہوں گا۔

اس بند کے آخری چند اشعار پیر رومی کو رفیق راہ بنانے کی تلقین کرتے ہیں کہ سوز

و گداز کی دولت بیدار صرف اسی طرح حاصل ہونی ممکن ہے۔ اقبال کو خداوندان مکتب اور

اہل خانقاہ سے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے حرف رومی کی تشریح تو کی، لیکن اس کی روح تک

نہیں پہنچے، اور اس لیے حقیقی معنی ہم سے یوں دور بھاگ گئے جیسے تیز روغزال، صوفیوں اور

ملاؤں نے پیر رومی کے کلام سے رقص تن کا سبق تو اخذ کیا، لیکن رقص جاں کی طرف سے

آنکھیں بند کر لیں، حالاں کہ رقص تن اور رقص جاں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک

زمین کی گردش کا سبب بنتا ہے اور دوسرا افلاک کو برہم کرتا ہے۔ رقص جاں کی بدولت علم

وحکت اور زمین اور آسمان پر تصرف حاصل ہوتا ہے، لیکن رقص جاں کا سیکھنا کوئی آسان کام

نہیں۔ آدمی جب تک اپنے جگر کو حرص و غم کی آگ سے خاکستر نہ کر دے، جان رقص میں نہیں



— پیام ہدیر صہ جلیوید —

آتی۔ رقصِ جاں طبیعت کا وہ اضطراب ہے جس کی طرف اقبال اپنے کلامِ نثر و نظم میں بار بار اشارے کرتے رہے ہیں۔ موجودہ نسل کے نوجوانوں کو مستقبل کی زندگی کا امین اور پاسبان سمجھ کر وہ ساری زندگی یہ آرزو کرتے رہے ہیں کہ نوجوان کو اس مثالی انسان کا نمونہ بنائیں جو زمانے کی لگام اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کا رخ اس بہتر زندگی کی طرف پھیر سکے، جو خالقِ ازلی کا مقصود ہے۔ اقبال کے پاس بقول ان کے ”صرف ایک بے چین اور مضطرب جان ہے۔“ ان کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ وہ اپنا اضطراب کسی ایسے نوجوان کے دل میں منتقل کر دیں جو اس کا اہل ہو۔

اکبر الہ آبادی کے نام ایک خط میں اقبال نے اس اضطراب کو کسی نوجوان کے دل میں منتقل کرنے کی آرزو ان لفظوں میں ظاہر کی ہے۔ ”صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں۔ قوتِ عمل مفقود ہے۔ ہاں یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابلِ نوجوان، جو ذوقِ خداداد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو، مل جائے، جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں۔“ (خطِ محررہ ۲۵، اکتوبر ۱۹۱۵ء)

اسی اضطراب کا نام ”جاوید نامہ“ کی مذکورہ بالا نظم میں ”رقصِ جاں“ ہے اور اسی کو ”ارمغانِ حجاز“ میں ”تب و تاب“ کہا گیا ہے۔ یہی رقصِ جاں، یہی تب و تاب اور اضطرابِ جاں ہے کہ اگر کسی نوجوان کے دل میں منتقل ہو جائے تو اقبال کے دل سے قبر میں بھی اس کے لیے دعائیں نکلیں گی۔ خود اقبال نے اپنی زندگی میں اس آرزو کو مناجات اور دعا کی صورت دی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ جہاں یہ دعا زباں پر آئی ہے، اس میں آرزو کی درد مندی نے بڑا سوز و گداز اور بڑی تاثیر پیدا کی ہے یہ آرزو ان کی نظم ”ساقی نامہ“ میں بڑی دل سوزی کے ساتھ دعا کا پیکر اختیار کرتی ہے۔

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے  
مرا عشق، میری نظر بخش دے



پیام ہدیہ جاوید

مرے دیدہ تر کی بے خوابیاں  
 مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں  
 مرے نالہ نیم شب کا نیاز  
 مری خلوت و انجمن کا گداز  
 انگلیں مری، آرزوئیں مری  
 امیدیں مری، جستجوئیں مری  
 مری فطرت آئینہ روزگار  
 غزالان افکار کے مرغزار  
 مرا دل مری رزم گاہ حیات  
 گمانوں کے لشکر یقین کا ثبات  
 یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر  
 اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر  
 مرے قافلے میں لٹا دے اسے  
 لٹا دے، ٹھکانے لگا دے اسے

علامہ اقبال نے ”جاوید نامہ“ میں جو طویل نظم خطاب بہ جاوید (سخنے بہ نژادوں) کے عنوان سے تخلیق کی ہے، اس کے فارسی متن کے ساتھ ہم نثر میں اردو ترجمہ اور پیش کر چکے ہیں۔ اس کا اردو میں منظوم ترجمہ جناب نظیر لدھیانوی نے کیا تھا۔ طلبہ کے مزید استفادے کے لیے یہ منظوم ترجمہ بھی یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

شاعری بے فائدہ ہے بالیقین  
 دل میں جو ہے وہ اگر لب پر نہیں  
 گرچہ سو نکلتے کیے میں نے بیاں  
 ایک نکتہ ہے کہ اب تک نہاں



پیامِ ہزیمہ جلوس

گر کہوں تو اور بھی پیچیدہ ہو  
صورت اور الفاظ سے پوشیدہ ہو  
یا تو تو میری نظر میں دیکھ اے  
یا مری آہ سحر میں دیکھ اے  
ماں نے ہے پہلا سبق تجھ کو دیا  
تیرا غنچہ اس کے دامن میں کھلا  
لطف سے اس کے ہے تیرا رنگ و بو  
ہے اسی سے بے بہا اے لعل تو  
تجھ کو مالِ جاوداں اس سے ملا  
تو نے حرفِ لا الہ اس سے سنا  
اے پسرِ ذوقِ نگہ اب مجھ سے لے  
ساز و سوز لا الہ اب مجھ سے لے  
لا الہ کہ روئے جاں سے اے جواں  
تاکہ آئے تن سے تیرے بوئے جاں  
مہر و مہ ہیں لا الہ سے دلِ فروز  
میں نے دیکھا کوہِ د کہ میں بھی یہ سوز  
لا الہ کس نے کہا گفتار ہے  
یہ تو اک شمشیر جو ہر دار ہے  
جو جیسے اس آگ میں قہار ہے  
لا الہ کی ضرب بے زہار ہے  
مومن اور پیشِ بشر باندھے نفاق  
مومن اور ہو بندہٗ غدر و نفاق!



— پیام بذریعہ جاوید —

دین و ملت بیچے کوڑی کے عوض  
 اس کو عزّ و آبرو سے کیا غرض!  
 لا الہ سے بے تہی اس کی نماز  
 ناز سے محروم ہے اس کا نیاز!  
 نور سے بے بہرہ ہیں صوم و صلوات  
 جلوں سے خالی ہے اس کی کائنات  
 ہائے تھا اللہ جس کا ساز و برگ  
 ہے اسے اب حبّ مال اور خوفِ مرگ  
 اب کہاں وہ مستی و ذوق اور وہ صبر  
 دیں کتابوں میں ہے اور وہ زیرِ قبر  
 رنگ لائی صحبتِ عصرِ جدید  
 دیں میں ”دو پیغمبروں“ کا ہے مرید  
 ایک ایرانی ہے اک ہندی نژاد  
 اس کو حج سے کد یہ بیزارِ جہاد  
 جب جہاد و حج سے ہو منکرِ حیات  
 کیوں نہ ہو بے جاں تنِ صوم و صلوات  
 جب کہ بے جاں ہوں نمازیں اور صیام  
 فرد کج رو ہو گا ملت بے نظام  
 قلب ہوں جب سورِ قرآن سے تہی  
 کیا بھلا ایسوں سے امید بھی  
 خود سے مسلم ہو گیا دور اے خضر  
 المدد، پانی گیا سر سے گزر



بہارِ بزمِ جہانگیر

سجدہ وہ ہے جو زمیں جس سے تپاں  
مہر و مہ ہوں جس کی مرضی پر رواں  
سنگ اگر لے ایسے سجدے کا نشان  
باد پر اڑنے لگے بن کر دھواں  
عصرِ نو کیا ہے اسیری کے سوا  
کیا ہے اس میں ضعفِ پیری کے سوا  
مگر شکوہ ربی الا علی گیا  
یہ گنہ اس کا ہے یا ہے قوم کا؟  
ہر کوئی ہے اپنی رہ پر تند رو  
اپنا ناتہ بے لگام اور ہرزہ رو  
صاحبِ قرآن ہو بے ذوقِ طلب  
العجب ثم العجب ثم العجب!  
مگر خدا تجھ کو کرے صاحبِ نظر  
آنے والے دور کو دیکھ اے پیر!  
عقل ہے اس میں نڈر، دل بے گداز  
آنکھ ہے بے شرم اور غرقِ مجاز  
علم و فن، دین و سیاست، عقل و دل  
ہو رہے ہیں سب فدائے آب و گل  
وہ وطن خورشید کا وہ ایشیا  
غیر میں ہے خود سے ہے نا آشنا  
قلب ہے بے وارداتِ نو بنو  
اس کے حاصل کی ہے قیمت ایک جو



— پیامِ ہذریعہ جاوید —

اس پرانے گھر میں اس کا روزگار  
سرد ہے اور پرسکون مثلِ مزار  
صید ملا اور نچیر ملوک  
ہے غزالِ فکر اس کا لنگ و لوک  
عقل و دین و دانش و ناموس و جنگ  
ہو رہے ہیں صید عیارِ فرنگ  
فکر پر کی اس کے یورش بار بار  
کردیا ہر راز اس کا آشکار!  
دل کو اپنے سینے میں خوں کر دیا  
اس کے عالم کو دگرگوں کر دیا  
ہے بیانِ عصرِ نو دو حرف میں  
گم کیا بحرین کو دو ظرف میں  
حرف پیچیدہ ہے اور نیش دار  
تا کروں عقل و دل مرداں شکار  
حرفِ پیچاں میں ہے اندازِ فرنگ  
نالہِ مستانہ ہے اور تارِ چنگ  
اصل اس کی ذکر اس کی اصل فکر  
اے کہ تو ہو مایہ دارِ فکر و ذکر  
آپ جو ہوں دو سمندر میری اصل  
فصل میری فصل ہے اور طرح وصل  
اک نیا انداز رکھتا تھا یہ دور  
ڈالا میری طبع نے ہنگامہ اور





— پیام بذریعہ جاوید —

نوجواں پیاسے ہیں اور خالی ایامِ  
 شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ!  
 کم نگاہ و بے یقین اور نا امید  
 ان کی آنکھیں دہر میں محروم دید!  
 نو جواں ہیں منکرِ خود محوِ غیر  
 ان کی مٹی سے بنی بنیادِ دیر!  
 اپنے مقصد سے ہے مکتب بے خبر  
 جذبِ دل کی راہ سے ہے دور تر!  
 جاں سے اس نے نورِ فطرت دھو دیا  
 اک گلِ رعنا نہ گلشن میں کھلا  
 نشتِ کج رکھتا ہے یہ معمارِ حال  
 شیر کو دیتا ہے یہ خوئے غزال  
 علم جب رکھتا نہیں سوئے حیات  
 دل کو کیا حاصل ہو لطفِ واردات  
 علم ہے شرحِ مقاماتِ خودی  
 علم ہے تفسیرِ آیاتِ خودی  
 چاہیے دل میں ہو پیدا نثارِ حس  
 تا ٹو جانے کہ ٹو زر ہے کہ مس  
 علمِ حق اولِ حواسِ آخرِ حضور  
 اس کے آخر پر نہیں حاوی شعور  
 سو کتابوں کا سبق تو نے پڑھا  
 وہ سبق اچھا نظر سے جو ملا



— پیام بذریعہ جاوید —

لوگ اس ملنے سے جو رکھتی ہے نظر  
مست ہوتے ہیں باندازِ دگر  
جس ہوائے صبح سے گل ہو چراغ  
لالہ اس بادِ سحر سے پُر ایام  
تھوڑا کھا کم بول کم سو بالعموم  
گرد اپنے صورت پر کار گھوم  
حق سے ہے انکار کرنا کافری  
ہے مگر انکار خود کافر تری  
ذات کے انکار سے وہ ہے عجول  
یہ عجول و ظالم و کور و جہول  
شیوہ اخلاص کو کر اختیار  
دل سے گم کر خوفِ شاہ و شہر یار  
عدل سے قہر و رضا میں کام لے  
قصد سے فقر و غنا میں کام لے  
حکم مشکل ہو تو تادیلیں نہ ڈھونڈ  
اپنا ہی دل دیکھ قدیلیں نہ ڈھونڈ  
حفظِ جاں ہے ذکر و فکر بے حساب  
حفظِ تن ہے ضبطِ دل وقتِ شباب  
تو جہاں کا حکمران ہے میرے شیر!  
حفظِ جان و تن سے یہ ہوتا ہے زیر  
سیر کی لذت ہے مقصودِ سفر  
تو نہ اُڑ، مگر آشیاں پر ہے نظر



— پیام ہذریعہ جلوبید —

ماہ گردش میں ہے تا پائے مقام  
جاءہ انساں میں ہے منزل حرام  
زندگی کو مائل پرواز رکھ  
اس کی فطرت سے ہمیشہ ساز رکھ  
رزق ہے زاغ و زغن کا گور میں  
رزق شاہیں کا ہے ماہ و ہور میں  
سر دیں ہے صدق قول اکل حلال  
خلوت و جلوت میں دیدار جمال  
راہ دیں میں سخت ہو الماس بن  
دل لگا تو حق سے بے وسواس بن  
سرز دیں ہو جائے گا تجھ پر عیاں  
سن مظفر کی حکایت اے جواں  
تھا عمل کے حسن میں فرد فرید  
حکراں تھا با مقام بایزید  
اسپ اپنا تھا بہت اس کو عزیز  
اپنے راکب کی طرح بے مثل چیز  
اس کے آبا میں نصیبان عرب  
با وفا بے عیب پاکیزہ نسب  
مرد مومن کو عزیز اے نکتہ رس  
کیا ہے بس قرآن و شمشیر و فرس  
کیا کہوں وصف اس کا وہ خیر البیاد  
کوہ اور دریا پہ چٹا مثل باد



— پیام بذریعہ جاوید —

روز ہیجا تھا نظر سے تیز تر  
 اک گولا طائف کوہ و کمر  
 اس کی رو میں فتنہ یوم النشور  
 پتھر اس کی ضربِ سُم سے چور چور  
 ہو گیا اک دن وہ اسپ باد پا  
 ناگہاں درو شکم میں جلا  
 دی دوا میں سے اسے بیطار نے  
 زندگی پائی نئی رہوار نے  
 پر سوار اس پر نہ پھر سلاطین ہوا  
 اے جواں یہ ہے کمال اتقا  
 دیں ہے کیا جلنا طلب میں روز و شب  
 انتہا اس کی ہے عشق، آغاز ادب  
 آبرو گل کی ہے اس کا رنگ و بو  
 بے ادب بے رنگ و بو، بے آبرو  
 دیکھتا ہوں جب جوان بے ادب  
 دن مرا ہوتا ہے تیرہ مثلِ شب  
 دل میں ہوتا ہے فزوں جوش و داد  
 مجھ کو عہدِ مصطفیٰ آتا ہے یاد  
 عہد سے اپنے بہت نالاں ہوں میں  
 کاش عہدِ رفتہ میں پنہاں ہوں میں  
 ستر زن ہے زوج یا خاک لحد  
 ستر مرداں کیا ہے ترک یارِ بد



— پیامِ ہدیہِ جاوید —

حرفِ بد کو لب پہ لانا ہے خطا  
کافر و مومن ہیں سب خلقِ خدا  
ہے شرافتِ احترامِ آدمی  
تو سمجھ کیا ہے مقامِ آدمی  
آدمی کو ہے ضروری میلِ جول  
مہرباں ہو دوستی کی راہ کھول  
مردِ حق ہے اور یزداں کا طریق  
کافر و مومن پہ ہے یکساں شفیق!  
کفر و دیں کو لے سر پہنائے دل  
دل ہو گر دل سے گریزاں وائے دل  
دل اگرچہ ہے اسیرِ آب و گل  
یہ تمام آفاق ہے آفاقی دل  
ہو اگر قسمت سے شاوِ بحر و بر  
تو کسی صورت نہ ترکِ فقر کر  
سوزِ اس کا خفتہ تیری جاں میں ہے  
تیرے آبا سے ہے یہ دیرینہ سے  
کچھ سوائے دردِ دوراں سے نہ مانگ  
حق سے نعمت مانگ سلطان سے نہ مانگ!  
ہیں بہت مردِ حق اندیش و بصیر  
ہو گئے جو فرطِ نعمت سے ضریح!  
ساہبا کی سیرِ مثلِ آفتاب  
منعموں کی آنکھ میں دیکھا نہ آب



— پیام ہذریعہ جاوید —

اس پہ قرباں جو ہے درویشی اساس  
 وائے وہ دل جو ہے یزداں ناشاس  
 ڈھونڈ مسلم میں نہ تو وہ سوز و شوق  
 وہ یقیں وہ رنگ و بو وہ درد و ذوق  
 علم قرآن سے ہیں عالم بے نیاز  
 اور صوفی گرگِ خونی، مو دراز  
 خانقاہوں میں ہے گرچہ ہا وہو  
 ہے نئے حق سے مگر خالی سبو  
 یہ مسلمانانِ افرنگی تاب  
 سمجھے ہیں کوثر اسے جو ہے سراب  
 ناشاس سز دیں ہیں سب کے سب  
 اہل کیں ہیں اہل کیں ہیں سب کے سب  
 خواص میں ہیں خیر اور خوبی حرام  
 بہرہ در صدق و صفا سے ہیں عوام  
 کر تمیز اہل دین و اہل کیں  
 ہم نشین حق کا ہو تو ہم نشین  
 کرگسوں کا رسم و آئیں اور ہے  
 سطوت پرواز شاہیں اور ہے  
 مرد حق کا وار ہے مانند برق  
 اس کا ایندھن شہر و دشتِ غرب و شرق  
 ہم ہیں محصورِ ظلام کائنات  
 وہ شریکِ اہتمام کائنات



— پیامِ ہدیرِ جلیوید —

وہ کلیم اور وہ مسیحا وہ خلیل  
وہ محمدؐ وہ کتاب اور جبریل  
وہ ہے مہر کائنات اہل دل  
اس کی وضو سے ہے حیاتِ اہل دل  
اپنی آتش میں جلانے گی تجھے  
پھر شہی کے گر سکھائے گی تجھے  
سوز سے اس کے ہی صاحبِ دل ہیں ہم  
ورنہ یکسر نقشِ آب و گل ہیں ہم  
یہ زمانہ جس میں تو پیدا ہوا  
غرقِ تن ہے، جاں سے ہے نا آشنا  
جب بدن ارزاں ہوں اور ہو قحطِ جاں  
رہتے ہیں مردانِ حق خود میں نہاں  
کارگر ہوتی نہیں ہے جستجو  
گرچہ مردِ حق کھڑا ہو زو برو  
تو مگر ہر آن رکھ زوقِ طلب  
گرچہ ہوں درپیشِ صد رنج و تعب  
گر نہ تجھ کو قربِ مردِ حق ملے  
جو ملا ہے مجھ کو آباء سے وہ لے  
پیرِ رومی کو رفیق رہ بنا  
تا گداز و سوز دے تجھ کو خدا  
ہے اسے معلوم فرقِ مغز و پوست  
نقشِ پا اس کا ہے شمعِ کوئے دوست



— پیام بذریعہ جاوید —

ہوں معافی اس کے کیوں کر دل نشیں  
 ترجمان اس کے اسے سمجھے نہیں  
 مثنوی سے رقصِ تن حاصل کیا  
 رقصِ جاں سے ہیں مگر نا آشنا  
 رقصِ تن گردش میں لائے خاک کو  
 رقصِ جاں برہم کرے افلاک کو  
 علم و حکم آتے ہیں رقصِ جاں سے ہاتھ  
 اور زمین و آسمان بھی ان کے ساتھ  
 فرد اس سے صاحبِ جذبِ کلیم  
 ملت اس سے وارثِ ملکِ عظیم  
 رقصِ جاں کا سیکھنا اک کام ہے  
 ماسوا سے جنگِ عینِ اسلام ہے  
 حرص اور غم کا اگر ہے دل میں گھر  
 رقصِ میں آتی نہیں جاں اے پر  
 ضعفِ ایمانی ہے دل گیری ہے غم  
 جانِ بابا! نیمہ پیری ہے غم  
 حرص غافل فقرِ حاضر کا ہے نام  
 خود پہ قاہر ہو جو ہوں اس کا غلام  
 ہو سکونِ جادواں سے بہرہ ور  
 تو اگر ہو رقصِ جاں سے بہرہ ور  
 جان لے اسراۓ دینِ مصطفیٰ  
 قبر میں بھی میں تجھے دوں گا دعا









باب نمبر ۱۸

# پیامِ منشور





اقبال نرے شاعر یا نرے فلسفی نہ تھے۔ وہ مصلح بھی تھے، سیاسی رہنما بھی تھے۔ پنجاب مسلم لیگ کے سرکردہ لیڈر تھے۔ پنجاب صوبائی اسمبلی کے منتخب رکن بھی رہے۔ قائد اعظم کو اپنا قائد سمجھتے تھے۔ گول میز کانفرنس میں شریک ہوتے تھے۔ سیاسی بیانات و اعلانات جاری کرتے تھے۔ پریس کانفرنس کرتے تھے۔ مشاہیر سے خط و کتابت کرتے تھے۔ سیاسی، ادبی و ثقافتی انجمنوں کی صدارت کرتے تھے، جہاں تقریریں کرتے تھے، صدارتی خطبات ارشاد فرماتے تھے۔ مدارس میں الہیات اسلامیہ پر لیکچر دیے جو کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

ان کی تقریروں، تحریروں، بیانات، اعلانات اور خطوط میں ان کے عقائد و افکار نثر کی صورت میں بکھرے پڑے ہیں۔ نوجوان نسل کے تعلق سے ان کے شاہکار نثر پاروں کا انتخاب یہاں شامل کیا جا رہا ہے۔

### اگلے مسلمانوں کا نصب العین

اسلام کی تاریخ دیکھو۔ وہ کیا کہتی ہے؟ عرب کے خطے کو یورپین معماروں نے ردی اور بے کار پتھر کا خطاب دے کر یہ کہہ دیا تھا کہ اس پتھر پر کوئی بنیاد کھڑی نہیں ہو سکتی۔ ایشیا اور یورپ کی قومیں عرب سے نفرت کرتی تھیں، مگر عربوں نے جب ہوش سنبھالا اور اپنے کس بل سے کام لیا، تو یہی پتھر دنیا کے ایوانِ تمدن کی محراب کی کلید بن گیا اور خدا کی قسم، روم جیسی باجبروت سلطنت عربوں کے سیلاب کے آگے نہ ٹھہر سکی۔ یہ اس قوم کی حالت ہے جو اپنے بل پر کھڑی ہوئی۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے خدا، اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دین اور اپنی قوت بازو پر بھروسہ رکھ کر حاکموں سے مؤدبانہ حاجات طلب کریں اور بنی نوع انسان میں امن و امان قائم رکھیں، کیونکہ اسلام شرف و فساد کی ممانعت کرتا ہے۔ ان اصولوں کو مد نظر رکھ کر باقی اقوام سے ربط و اتحاد بڑھائیں اور جو کچھ سیکھ سکتے ہیں، انھیں سکھائیں۔ جو سکھا سکتے ہیں، ان

پیام منور

سے سیکھیں، اور حتی الوسع ہمارا وہ نصب العین ہو جو اگلے مسلمانوں کا تھا۔“

جلسہ عام، بیرون موچی دروازہ، لاہور۔ یکم فروری ۱۹۱۲ء

## اسلام میں جبری تعلیم

اس جلسے میں مسٹر گوکھلے کے تعلیمی بل کے جبریہ پہلو پر غور ہوگا۔ لفظ جبر سے کسی کو کھڑکا نہ ہونا چاہیے۔ جس طرح چیچک کا ٹیکا لازمی اور جبری قرار دیا گیا ہے اور یہ لزوم و جبر اس شخص کے حق میں کسی طرح مضر نہیں ہو سکتا جس کے ٹیکا لگایا جاتا ہے اسی طرح جبریہ تعلیم بھی قابل اعتراض متصور نہیں ہو سکتی۔ جبریہ تعلیم بھی گویا روحانی چیچک کا ٹیکا ہے۔ اسلام میں جبر کی تعلیم موجود ہے۔ مسلمانوں کو حکم ہے کہ اپنے بچوں کو زبردستی نماز پڑھائیں۔

جلسہ، اسلامیہ کالج، لاہور۔ ۱۸ فروری ۱۹۱۲ء

## اسلام اور اشتراکیت

میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے۔ لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے، جیسا کہ بولشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانون میراث اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابل عمل بھی ہے۔ روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِ عمل ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں..... مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصول سیاسی یا تو خالص اسلامی



ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے۔

مکتوب بہ نام روزنامہ ”زمیندار“ لاہور۔ ۲۴ جون ۱۹۲۳ء

## قلب کی فطرت

مسلمانوں کی زندگی کا راز اتحاد میں مضمر ہے۔ میں نے برسوں مطالعہ کیا۔ راتیں غور و فکر میں گزار دیں، تاکہ وہ حقیقت معلوم کروں جس پر کاربند ہو کر عرب حضور سرور کائناتؐ کی صحبت میں تیس سال کے اندر اندر دنیا کے امام بن گئے۔ وہ حقیقت اتحاد و اتفاق میں ہے جو ہر شخص کے لبوں پر ہر وقت جاری رہتی ہے، کاش ہر مسلمان کے دل میں بیٹھ جائے۔ نسلی اور اعتقادی اختلافات میں تنگ نظری اور تعصب نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا۔ اختلاف رائے ایک طبعی امر ہے، اس لیے کہ طبائع مختلف ہوتی ہیں۔ ہر شخص کی نظر مختلف ہے۔ اسلوب فکر مختلف ہوتی ہے۔ لیکن اس اختلاف کو اس طریقے پر رکھنا چاہیے، جس طرح کہ ہمارے آباء و اجداد نے اسے رکھا۔ اس صورت میں اختلاف رحمت ہے۔ جب لوگوں میں تنگ نظری آجاتی ہے تو یہ زحمت بن جاتا ہے۔ مسلمانو! میں تمہیں کہتا ہوں کہ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو متحد ہو جاؤ۔ اختلاف بھی کرو تو اپنے آباء کی طرح۔ تنگ نظری چھوڑ دو۔ میں کہتا ہوں کہ تنگ نظری چھوڑنے سے سب اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مخالف کو بھی نرمی سے سمجھاؤ۔ قلب کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ محبت سے رام ہو سکتا ہے۔ مخالفت اور عداوت سے رام نہیں ہو سکتا۔

انتخابات کے سلسلے میں ایک تقریر، لاہور۔ ۱۹ نومبر ۱۹۲۶ء

## مذہب اور سائنس کا تعلق

مذہب، فلسفہ، طبیعیات اور دیگر علوم و فنون سب کے سب مختلف راستے ہیں جو ایک ہی منزل مقصود پر جا کر ختم ہوتے ہیں۔ مذہب اور سائنس کے تصادم کا خیال اسلامی نہیں کیوں کہ سائنس یعنی علوم جدیدہ اور فنونِ حاضرہ کے باب کھولنے والے تو مسلمان ہی ہیں اور

اسلام ہی نے انسان کو منطق کا استقرائی طریق سکھایا اور علوم کی بنیاد نظریات اور قیاسات پر رکھنے کے طریق کو مسترد کرنے کی تعلیم دی اور یہی بات علوم جدیدہ کی پیدائش کا موجب ہوئی۔

قرآن کریم کے ہر صفحے پر انسان کو مشاہدے اور تجربے کے ذریعے علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور منہجائے نظر، یہ بتایا گیا ہے کہ قوائے فطرت کو مسخر کیا جائے۔ چنانچہ قرآن پاک تو صاف الفاظ میں انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر وہ قوائے فطرت پر غلبہ حاصل کر لیں گے تو ستاروں سے بھی پرے پہنچنے کے قابل ہو جائیں گے۔

مسلمانوں میں فرقہ معزز اور دیگر فرقوں کے درمیان جو تنازع پیدا ہوا تھا، وہ اس قسم کا نہ تھا جو یورپ کے روشن دماغ علماء اور تاریک خیال پادریوں کے درمیان پیدا ہوا، بلکہ وہ تو ایک علمی بحث تھی، جس کا موضوع محض یہ تھا کہ آیا ہمیں الہامی کلام ربانی کو عقل انسانی کے معیار پر پرکھنے کا حق حاصل ہے یا نہیں۔“

جلسہ اسلامیہ کالج، لاہور۔ ۳ مارچ ۱۹۷۷ء

فنا فی اللہ بھی نہیں

حقیقت کا مشاہدہ دو طرح سے ہوتا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل آیت ۳۶ میں آیا ہے:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ

عَنْهُ مُسَوِّدًا

”اور ایسی بات کے پیچھے نہ پڑو جس کا تجھے علم نہیں کیونکہ بے شک تمہارے کان، آنکھ اور دل سب کے متعلق سوال ہوگا۔“

اس آیت میں حصول علم کے ذریعوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک ذریعہ تو سمع و بصر ہے اور دوسرا ذریعہ انسان کا قلب ہے۔ یعنی یہ نہ ہو کہ سمع و بصر کو چھوڑ کر کلی طور پر قلب کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور ایسا بھی نہ ہو کہ قلب سے غافل ہو کر یورپ والوں کی طرح بالکل سمع



دبھر کے ہو رہو۔ مسلمانوں نے اپنی توجہات قلب پر مرکوز کر دیں اور صبح و بھر کے پورا کام نہ لیا۔ نظام عالم کی آفرینش یوں ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی نمو کے لیے یا اپنے آپ کو ظاہر و نمایاں کرنے کے لیے دنیا کو پیدا کیا۔ اس خط سفر کا آخری نقطہ عالم ظاہر ہے۔ اب حقیقت تک پہنچنے کی راہ یہ ہے کہ اس آخری نقطے سے الٹا سفر کیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مظاہر کو چھوڑ کر حقیقت کی طرف متوجہ ہوں۔ اس کا مقصد یہ نہ ہونا چاہیے کہ انسان مشاہدہ حقیقت کے ساتھ اپنے آپ کو فنا کر دے۔ اسلام کا عندیہ یہ ہے کہ حقیقت کا مشاہدہ مردانہ وار کیا جائے۔ اسلامی نقطہ خیال میں یہی معراج ہے کہ مشاہدہ ذات کے بعد بھی عبودیت قائم ہے، لیکن تہذیب و سرکشی کے لیے نہیں، بلکہ خدمت و عبادت کے لیے۔ مسلم کو کسی چیز میں فنا نہ ہونا چاہیے، گو یہ فنا فی اللہ کیوں نہ ہو۔

انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس سے خطاب۔ ۲۰ اپریل ۱۹۹۷ء

## ہندوؤں کی ذہنیت

میں حیران ہوں کہ مسلمانوں کے خلاف اس قسم کی ذہنیت اختیار کرنے کی ہندوؤں کو کیوں ضرورت پڑی۔ مسلمان تعداد میں کم ہیں۔ اقتصادی حیثیت سے پیچھے ہیں۔ تعلیم میں پس ماندہ ہیں۔ ویسے بڑے بھولے بھالے ہیں۔ حکومت انھیں آسانی سے چکلی چڑی باتیں کر کے پھسلالیتی ہے، ہندو انھیں پھسلالیتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ ہندوؤں نے یہ ذہنیت کیوں اختیار کی اور یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی ذہنیت ہے۔

جداگانہ طریق انتخاب کے حق میں صوبائی مسلم لیگ کے اجلاس میں ایک تقریر۔ یکم مئی ۱۹۹۷ء

## تحریر کی آزادی

ذاتی طور پر میں اخبارات کی آزادی کا بہت بڑی حد تک قائل ہوں، بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں آزادی کا حامی ہوں، لیکن میں دلائل سے متاثر نہیں ہو سکتا اور آزادی اور لائسنس کو یکساں نہیں سمجھ سکتا۔ حقیقی آزادی اخلاقی ضابطہ نفس کا نتیجہ ہوا کرتی ہے..... اگر دیکھی



پیام منثور

اخبارات سنسنی پھیلانے والے عنوان لکھنا چھوڑ دیں، تقریروں وغیرہ کی رپورٹ کرنے کے لیے بہتر آدمی رکھیں۔ ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات کو، جو کسی اور طریقے کی معاشرت میں جاذب توجہ نہیں ہو سکتے، فرقہ وارانہ رنگ دینے سے احتراز کرنے لگیں تو دیسی زبانوں کے اخبارات کی تعلیمی قدر و قیمت بہت بڑھ سکتی ہے۔ ایسے ملک میں، جہاں عام اشخاص نقاد نہیں اور سطحی عقل رکھنے والے ہیں، ایسی احتیاط نہایت ضروری ہے۔ بہر حال اس اعلان کا مقصد اخبارات کے لب و لہجے کی اصلاح کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ ان کی آزادی کو سلب کرنا نہیں۔“

”مسلم آؤٹ لک“ کے نمائندے سے انٹرویو۔ ۲۳ مئی ۱۹۲۷ء

### امت مسلمہ کا اجتماع

میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سر سید احمد خان مرحوم نے مسلمانوں کے لیے جو راہِ عمل قائم کی تھی، وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہِ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے..... آج میں نہایت صاف لفظوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں بہ حیثیت مسلمان ہونے کے زندہ رہنا ہے تو ان کو جلد از جلد اپنی اصلاح و ترقی کے لیے سعی و کوشش کرنی چاہیے اور جلد از جلد ایک علیحدہ پولیٹیکل پروگرام بنانا چاہیے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں بعض حصے ایسے ہیں، جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بعض حصے ایسے ہیں، جن میں وہ قلیل تعداد میں ہیں۔ ان حالات میں ہم کو علیحدہ طور پر ایک پولیٹیکل پروگرام بنانے کی ضرورت ہے..... آج اس کانفرنس میں متفقہ طور پر جو ریزولوشن پیش ہوا ہے، وہ نہایت صحیح ہے اور اس کی صحت کے لیے میرے پاس ایک مذہبی دلیل ہے اور وہ یہ کہ ہمارے آقائے نامدار حضور سرورِ عالم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری امت کا اجتماع کبھی گمراہی پر نہ ہوگا۔

آل پارٹیز مسلم کانفرنس، دہلی۔ یکم جنوری ۱۹۲۹ء



— بیام منور —

ہم مسلمانوں کو چاہیے کہ فقہ کی طرف متوجہ ہوں۔ جو حقوق ملتِ اسلامیہ نے عورتوں کو دیے ہیں، وہ ان کے حصول پر اصرار کریں۔ شوہر، باپ، بھائی کون سیاہ دل مرد ہوگا جو آپ کو آپ کے حقوق دینے سے انکار کرے گا۔ ہمیں تو ملک میں مسلمانوں کے اندر اس قسم کی رائے عامہ پیدا کرنی چاہیے کہ جب تک یہ طے نہ پا چکے کہ آئندہ (شادہ شدہ) زندگی میں عورتوں کے کون کون سے حقوق ہوں گے، اس وقت تک نکاح نہ پڑھایا جائے۔ یہ تحریک بہت زور سے شروع ہوئی چاہیے۔ مسلمان عورتیں مسلمان قوم کی بہترین روایات کی حفاظت کر سکتی ہیں۔ بشرطیکہ وہ اصلاح کا صحیح اور عقل مندانہ رستہ اختیار کریں اور ترکی یا دیگر یورپین ممالک کی عورتوں کی اندھا دھند تقلید کے درپے نہ ہو جائیں۔

خطاب: انجمن خواتین اسلام، مدراس ۷ جنوری ۱۹۲۹ء

## قدامت پسند اور ترقی پسند

اس امر کے یقینی ہونے میں کوئی شبہ نہیں کہ عالم اسلام میں قدامت پسند جذبات اور لبرل خیالات میں جنگ شروع ہو گئی ہے۔ اغلب ہے کہ قدامت پرست اسلام جدوجہد کے بغیر تسلیم خم نہیں کرے گا۔ اس لیے ہر ایک ملک کے مسلم مصلحین کو چاہیے کہ نہ صرف اسلام کی حقیقی روایات کو غور کی نگاہ سے دیکھیں، بلکہ جدید تہذیب کی صحیح اندرونی تصویر کا بھی احتیاط سے مطالعہ کریں، جو بے شمار حالتوں میں اسلامی تہذیب کی مزید ترقی کا درجہ رکھتی ہے۔ جو چیزیں غیر ضروری ہیں ان کو ملٹومی کر دینا چاہیے، کیوں کہ صرف ضروری چیزیں فی الوقت قابل لحاظ ہیں۔ یہ امر صحیح نہیں ہے کہ مجلسی معاملات میں قدامت پسندانہ طاقتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے کیوں کہ انسانی زندگی اپنی اصلی روایات کا بوجھ کندھوں پر اٹھا کر منزل ارتقاء طے کرتی ہے۔ انسان نے اپنی معاشرتی تہذیب کو تشکیل دینے کا سبق حال ہی میں سیکھا ہے، اس لیے جائز حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔

افغانستان پر بچہ سقہ کے قبضے کے خلاف اشریو۔ ۲۶ فروری ۱۹۲۹ء



## دیوارِ گریہ کی حقیقت

فلسطین میں مسلمان اور ان کے بیوی بچے شہید کیے جا رہے ہیں۔ اس ہولناک سفاکی کا مرکز یروشلم ہے جہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے۔ اس مسجد کا تعلق حضرت خواجہ دو جہاں کے معراج مبارک سے ہے اور معراج ایک دینی حقیقت ہے، جس کا تعلق مسلمانوں کے گہرے جذبات کے ساتھ ہے۔ صدیاں گزر گئیں کہ ایک معبد تیار ہوا تھا، جسے ”ہیکل سلیمانی“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ معبد مسلمانوں کے یروشلم فتح کرنے سے بہت پہلے برباد ہو گیا۔ آنحضرتؐ نے معراج کا ذکر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا تو انھیں ہیکل یا مسجد اقصیٰ کے صحیح موقع و محل سے بھی مطلع کر دیا۔ فتح یروشلم کے بعد حضرت عمرؓ بہ نفس نفیس یروشلم تشریف لے گئے تو انھوں نے مسامحہ شدہ ”ہیکل سلیمانی“ کا محل وقوع دریافت فرمایا اور وہ جگہ ڈھونڈ لی۔ اس وقت اس جگہ گھوڑوں کی لید جمع تھی، جسے انھوں نے اپنے ہاتھ سے صاف کیا۔ مسلمانوں نے جب اپنے خلیفہ کو ایسا کرتے دیکھا تو انھوں نے بھی جگہ صاف کرنی شروع کر دی اور یہ میدان پاک ہو گیا۔ عین اسی جگہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی، جس کا نام مسجد اقصیٰ ہے۔ یہود و نصاریٰ کی تاریخ میں تو یہ کہیں مذکور نہیں ہے کہ موجودہ مسجد اقصیٰ اسی جگہ پر واقع ہے جہاں ہیکل سلیمانی واقع تھا۔ اس شخص کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے۔ یہود و نصاریٰ نے اس کی زیارت کے لیے اس وقت آنا شروع کیا جبکہ یہ مشخص ہو چکی تھی۔

ترک یہودیوں کے ساتھ غیر معمولی رواداری کا سلوک کرتے رہے۔ یہودیوں کی خواہش پر انھیں مخصوص اوقات میں دیوارِ براق کے ساتھ کھڑے ہو کر گریہ و بکا کرنے کی اجازت عطا کی۔ اس وجہ سے اس دیوار کا نام ان کی اصطلاح میں ”دیوارِ گریہ“ مشہور ہو گیا۔ شریعت اسلامیہ کی رو سے مسجد اقصیٰ کا سارا احاطہ وقف ہے۔ جس قبضے اور تصرف کا یہود اب دعویٰ کرتے ہیں، قانونی اور تاریخی اعتبار سے اس کا حق انھیں ہرگز نہیں پہنچتا، سوائے



— پیام منور —

اس کے کہ ترکوں نے انھیں گریہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی۔

یوم فلسطین، لاہور۔ صدارتی خطبہ۔ ۷ ستمبر ۱۹۴۹ء

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے طلبہ سے خطاب

عزیز طلبہ! ممکن ہے کہ آپ کو یہ اندیشہ ہو کہ میں آپ کے پاس نامے کے جواب میں ایک ناصح مشفق کی طرح آپ کو کوئی نصیحت کرنے یا بعض نکات حکمت پیش کرنے لگوں گا، لیکن آپ سے فوراً اور صاف کہہ دیتا ہوں کہ میرے پاس اس قسم کی پسند و نصیحت کچھ نہیں اور نہ میرے پاس کوئی نکتہ حکمت ایسا ہے جو دوسروں کے لیے بطور دستور العمل پیش کر سکوں، مگر پھر بھی میں ایک دو باتیں ایسی کہوں گا جو کتابوں پر نہیں، میرے ذاتی تجربے پر مبنی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ جب سے ہمارے تعلقات یورپ اور خصوصاً انگلستان سے قائم ہوئے ہیں، اس وقت سے بہت سی چیزیں ہم تک وہاں سے پہنچی ہیں۔ سب سے اول چیز انگریزی لٹریچر ہے جو ہمارے بہت سے نوجوان مصنفین کے لیے تخلیق مضامین کا ذریعہ ہوا ہے، وہ مضامین جنہوں نے موجودہ نسل کی ذہنیت کی تشکیل و توضیح میں بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ دوسری بات جو ہم کو انگلستان سے ملی ہے، وہ افکار کی عادت ہے۔ میرے نزدیک یہ عادت اس ملک کے لیے بہترین نعمت ہے جس نے واقعات کے خلاف آنکھیں بند کر لی ہیں اور مسلسل طور پر محض خیال آرائیوں سے کام لیتا رہا ہے۔ الغرض فکرِ ثقیل کی عادت ہم کو انگلستان سے ملی ہے اور درحقیقت یہی وہ چیز ہے جس کی اس وقت تمام مشرق کو ضرورت ہے۔ تیسری چیز جو انگلستان نے ہم کو دی ہے، وہ ایک مشتبہ قدر و قیمت کی چیز ہے اور وہ ”ڈیموکریسی“ ہے۔ جس صورت میں یہ ”ڈیموکریسی“ آچکی ہے اور جو بہ مقدار کثیر آئندہ آنے والی ہے، وہ افسوس ہے کہ میرے دل کو نہیں بھاتی۔ ذاتی طور پر میں اس ”ڈیموکریسی“ کا معتقد نہیں ہوں اور محض اس لیے اس کو گوارا کر لیتا ہوں کہ اس کا کافی الحال کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ مگر خیر اب چوں کہ یہ ”ڈیموکریسی“ انگلستان سے آچکی ہے، اس لیے یہ دیکھنا ضروری



پیام منور

ہے کہ یہ موجودہ نسلِ نوجوانوں کے لیے کس قدر مفید ہے واضح ہو کہ ”ڈیہو کر یسی“ کے معنی صاف، علیٰ رؤس الاشہاد اور آزادی بحث و تحقیق ہیں۔

ایک دوسری بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ ہمارا انکشافِ ماضی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنے ماضی سے محبت کرتے ہیں۔ میں تو مستقبل کا معتقد ہوں، مگر ماضی کی ضرورت۔ مجھے اس لیے کہ میں حال کو سمجھوں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ سرچشمہ تہذیب و شائستگی کو سمجھا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آج دنیائے اسلام میں کیا ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ ماضی کو سمجھیں۔ چونکہ ہم جدید تہذیب و شائستگی کے اصولوں سے ناواقف ہیں، اس لیے ہم علومِ جدیدہ کو حاصل کرنے میں دیگر اقوام سے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان گم گشتہ رشتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعے سے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ علومِ جدیدہ پر اصولی استقرائی عائد کیا گیا ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جو قرآن شریف نے دنیا بھر کو عطا فرمائی ہے۔ اس طریقہ استقرائی کے نتائج و ثمرات ہم کو آج نظر آرہے ہیں۔ میں گزشتہ بیس برس سے قرآن شریف کا بغور مطالعہ کر رہا ہوں، ہر روز تلاوت کرتا ہوں۔ مگر ابھی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ حصوں کو سمجھ گیا ہوں۔ اگر خدا نے توفیق دی اور فرصت ہوئی تو میں ایک دن کامل تاریخ اس بات کی قلم بند کروں گا کہ دنیائے جدیدہ اس طرح حیات سے کس طرح ترقی کرتی ہوئی بنی ہے جو قرآن شریف نے ظاہر کیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ یونیورسٹی ایسے لوگوں کی ایک تعداد پیدا کر دے گی جو مطالعہ قرآن میں اپنی زندگیوں صرف کر دیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ میرے ساتھ مل کر کام کریں۔ گزشتہ چند سال سے میں صرف اپنے جسدِ خاکی کا مالک ہوں۔ میری روح ہمیشہ آپ کی خدمات کے لیے حاضر رہی ہے اور جب تک میں زندہ ہوں، وہ آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔“

اجلاسِ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین۔ ۲۹ نومبر ۱۹۳۹ء



## قوم پرستی کا مفہوم

پہلے معلوم کرنا چاہیے کہ قوم پرستی کا مفہوم کیا ہے۔ نیشنلزم کا جو تجربہ یورپ میں ہوا، اس کا نتیجہ بے دینی اور لامذہبی کے سوا کچھ نہیں نکلا۔ وہی ہندوستان میں ہو رہا ہے۔ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ حکم موجود ہے جس میں فرمایا گیا تھا کہ آج میں نسل، ذات، پات اور برادری کے تمام امتیازات کو پاؤں کے نیچے چکلتا ہوں۔ تم سب مسلمان ہو اور یہی تمہارا صحیح نام ہے۔ ہندوستان میں جس قدر اقوام ہیں سب چاہتی ہیں کہ ان کی خصوصیات باقی رہیں، اس لیے مسلمان بھی یہی چاہتے ہیں۔ مسلمان دوسروں پر حکومت نہیں چاہتے، اور نہ یہ چاہتے ہیں، دوسرے ان پر حکمران ہوں اور وہ ان کے غلام بنے رہیں۔ مسلمان نوجوانوں کو چاہیے کہ سب سے زیادہ قربانی کرنے کو تیار رہیں۔

مسلم نوجوانوں کو چاہیے کہ منظم ہو جائیں اور یہ کوشش اس لیے ہیں کہ آپ گوڈ اور بھیل نہ بن جائیں۔ ابھی آپ کو ایک شدید جنگ میں قربانیاں کرنی ہیں اور وہ سرمایہ داری کی لعنت کے خلاف جنگ ہے۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ اس کے لیے بھی ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار رہیں۔ اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ کوئی دوسری قوم یا انگریز اس کی دست گیری کرے گا تو وہ بد بخت ہے۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ، ورنہ تمہیں کوئی حق نہیں کہ زندہ رہو۔

جلسہ عام، بیرون موچی دروازہ، لاہور۔ ۲ مئی ۱۹۳۱ء

## یوم کشمیر پر اپیل

مسلمانو! پورے حملے کے تمہارے دشمن کو اب یہ گمان ہو گیا ہے کہ مسلمان ایک مردہ قوم ہے۔ اس گمان کو غلط ثابت کرنے کے لیے آپ کا یہ فرض ہے کہ ”یوم کشمیر“ کو کامیاب بنائیں۔ اور دشمن پر عملاً ثابت کر دیں کہ آپ ظلم و تعدی کی برداشت کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔



پیام منثور

مسلمانان کشمیر پر مظالم کے خلاف ۱۲ اگست ۱۹۳۱ء

## نوجوانوں کو نصیحت

گزشتہ دس سال سے ہم اپنے اقتصادی و سیاسی فوائد کو پس پشت ڈال کر کانگریس اور ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کی کوشش کرتے رہے، لیکن اس میں ہم کو برابرنا کامی کامندیکھنا پڑا۔ لہذا اب اگر لندن میں (گول کانفرنس) بھی فرقہ وارانہ اتحاد کی کوئی قابل اطمینان صورت نہ نکلی اور مکمل ”پروانشل اٹانومی“ نہ دی گئی اور مرکزی حکومت میں ان کا کافی خیال نہ کیا گیا تو مسلمانان ہند کو اجتماعی زندگی پر انفرادی زندگی کو قربان کرنا پڑے گا، اور مجھے یقین ہے کہ اگر بنگال اور پنجاب کی اکثریت اور مسلمانوں کے دیگر مطالبات کو تسلیم نہ کیا گیا تو جو دستور اساسی بھی ہندوستان کو دیا جائے گا، مسلمان ہند اس کے پرچے اڑا دیں گے۔

سن رسیدہ نسل نے نوجوانوں کو اپنی جانشینی کے لیے تیار کرنے کا کام جیسا چاہیے تھا، ہرگز نہیں کیا۔ لہذا میں نوجوانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ قرآن پاک کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھیں، اور اگر ان کو زندہ رہنا ہے تو وہ ان قربانیوں کے لیے تیار رہیں، جو ہمیشہ سے زیادہ ان کو آئندہ دینی ہوگی۔

دہلی صوبہ مسلم کانفرنس ۹ ستمبر ۱۹۳۱ء

## اسلام کے اندرونی دشمن

اسلام کے سوا دنیا کی کوئی طاقت اس الحاد اور مادیات کا مقابلہ کامیابی سے نہیں کر سکتی جو یورپ سے نشرو اشاعت حاصل کر رہا ہے۔ مجھے اسلام کے خارجی دشمنوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ میرے خیال میں اگر کوئی خطرہ ہے تو اندرونی دشمنوں سے ہے۔

مؤتمر عالم اسلامی، یروشلم - ۱۲ دسمبر ۱۹۳۱ء



## جاویداقبال کے نام مکتوب

میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ میں اس مسجد کے دیکھنے کے لیے زندہ رہا۔ یہ مسجد تمام دنیا کی مساجد سے بہتر ہے۔ خدا کرے، تم جوان ہو کر اس عمارت کے انوار سے اپنی آنکھیں روشن کرو۔  
۹ فروری ۱۹۳۲ء

رات کے تارے جو اپنی چمک دمک کے لیے تاریکی کے محتاج ہیں اور جو محض روشنی کی چنگاریاں ہیں، ان کی عمر اس قدر لمبی ہے کہ انسانی عقل اس کا اندازہ کرنے سے قاصر ہے۔ پھر انسان جو قدرت کا روشن ترین ستارہ ہے، کیا ایک عارضی زندگی رکھتا ہے اور روشنی کی آسمانی چنگاری سے بھی گزرا ہے؟ نہیں اس کی عمر ستاروں کی عمر سے بدرجہا زیادہ ہے۔ یہ ایک نہ بجھنے والا چراغ ہے۔ (روزگار فقیر - ۱۴۱)

آدمی اگر کچھ وقت کے بعد اپنے مصائب اور غم کو بھول جاتا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں کہ وقت میں کوئی پوشیدہ قوت ہے جس سے وہ انسانی غموں کو پرانا کر کے فنا کر دیتا ہے۔ ہم جو مرنے والوں کو فراموش کر دیتے ہیں تو یہ فراموشی وقت کے گزر جانے کا اثر نہیں بلکہ ہماری فطرت میں ایک احساس مخفی ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان سر کر فنا نہیں ہوتا۔ لطیف احساس کی وجہ سے ہمارا غم دور ہو جاتا ہے۔ بس گزرے ہوئے عزیزوں کی طرف سے بے پروائی اور گو نہ غفلت روح کے اس احساس کی وجہ سے ہے کہ ہمارے عزیز زندہ موجود ہیں اگر وہ حقیقت میں فنا ہو چکے ہوتے تو یقیناً ہمارا غم کبھی ختم نہ ہوتا۔ (روزگار فقیر - ۱۴۲)

زندگی میں کامیابی کا انحصار عزم پر ہے نہ کہ عقل پر (شذرات - ۱۴۲)  
پندار کی تسکین میں ہمارے لیے ایک معاشی پہلو بھی ہے آپ مجھے ”ہسپتال اسٹنٹ“ کے بجائے ”سب اسٹنٹ سرجن“ کہیں تو میں بالکل مطمئن ہو جاؤں گا، خواہ آپ میری تنخواہ میں کوئی اضافہ نہ کریں۔ (شذرات - ۱۶۹)

بلند حوصلگی، عالی ظرفی، سخاوت، اور اپنی روایات اور قوت پر جائز فخر ایسی چیزیں





پیام منور

ہیں جو شخصیت کے احساس کو مستحکم کرتی ہیں۔ (شذرات - ۷۷)

کسی معاشرے میں مذہب کا سب سے بڑا امین و محافظ کون ہوتا ہے؟ عورت ہوتی ہے۔ (شذرات - ۸۵)

اپنی حدود کو پہچانے اپنی صلاحیتوں کو پرکھیے۔ پھر زندگی میں آپ کی کامیابی یقینی ہے۔ (شذرات - ۱۲۲)

تو میں شعراء کے دلوں میں جنم لیتی ہیں اور سیاست دانوں کے ہاتھوں میں پلتی ہیں اور مر جاتی ہیں۔ (شذرات - ۱۲۸)

ضبط نفس افراد میں ہو تو خاندانوں کی تعمیر ہوتی ہے۔ قوموں میں ہو تو سلطنتیں قائم ہوتی ہیں۔ (شذرات - ۱۳۶)

محبت اکسیر سے بڑھ کر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اکسیر ادنیٰ دھاتوں کو سونا بادیتی ہے، لیکن محبت تمام سفلی جذبات کو خود اپنے پاکیزہ وجود میں تبدیل کر دیتی ہے۔ (شذرات - ۱۱۵)

اسلام ذاتی رائے کا معاملہ نہیں ہے۔ (حرف اقبال - ۶۱)

درخت جڑ سے نہیں، پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ (حرف اقبال - ۱۳۲)

ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ (حرف اقبال - ۱۳۲)

اسلام میں نماز باجماعت حصول معرفت ہی کا سرچشمہ نہیں، اس کی قدر قیمت کچھ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ (خطبات - ۱۴۱)

اگر ہم چاہتے ہیں کہ عبادت کا مقصد زیادہ کامیابی سے حاصل ہو سکے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اسے اجتماعی شکل دیں۔ (خطبات - ۱۳۸)

قرآن مجید کے نزدیک تو انسان ہونا، نام ہی اس بات کا ہے کہ ہر قسم کی سختیاں اور



پیام مختور

مصائب برداشت کیے جائیں۔ (خطبات ۱۳۵)

علم کی جستجو جس رنگ میں بھی کی جائے، عبادت ہی کی ایک شکل ہے۔ (خطبات ۱۳۷)

قرآن مجید کی روح سے کائنات میں اضافہ ممکن ہے۔ (خطبات ۸۵)

زندگی کا راستہ موت درموت سے گزرتا ہے۔ (خطبات ۸۳)

اگر انسان پہل نہیں کرتا۔ اپنی ذات کی وسعتوں اور گونا گوں صلاحیتوں کو ترقی نہیں دیتا، زندگی کی بڑھتی ہوئی زد کو کوئی تقاضا اپنی اندرونی ذات میں محسوس نہیں کرتا تو اس کی روح پتھر کی طرح سخت ہو جاتی اور وہ گر کر بے جان مادہ کی سطح پر جا پہنچتا ہے۔ (خطبات ۱۹)

انسانی سیرت کا تقاضا ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرے، اس میں سختی اور پختگی پیدا ہوتی

جائے۔ (خطبات ۱۸۶)

تغیر و تبدل وہ حقیقت ہے جسے قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی آیت

ظہر ایا ہے۔ (خطبات ۲۷)

یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے، وہ معض بودے اور ست تاروں کا بنا ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔ قومیت کے اصول صرف اسلام ہی نے بتائے ہیں، جن کی پختگی اور پائیداری مرد و رایام سے متاثر نہیں ہو سکتی (مکاتیب اقبال ۹)

آزردگی اور پریشاں خاطری مسلمان کا شیوہ نہیں۔ اسلام کی حقیقت فقر

ہے۔ (مکتوبات اقبال ۳۰۳)

اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا کے شور و غوغا میں آپ کی آواز سنی جائے تو آپ کی روح پر محض ایک ہی خیال کا غلبہ ہونا چاہیے۔ مقصد واحد کی لگن والا شخص ہی سیاسی اور معاشرتی انقلابات پیدا کرتا ہے، سلطنتیں قائم کرتا ہے اور دنیا کو آمین عطا کرتا ہے۔ (شذرات ۱۶۹)

خدا اور شیطان دونوں انسان کو مواقع فراہم کرتے ہیں اور یہ اسی پر چھوڑ دیتے ہیں

کہ وہ ان مواقع سے جیسا مناسب سمجھے فائدہ اٹھائے۔ (شذرات ۱۵۲)



پیام منثور

راوی کے کنارے غروب آفتاب کے ایک پراجلال منظر کے مقابلے میں آپ کے کتب خانے کا سارا حیرت انگیز کتابی علم و دانش ہیچ ہے۔ (شذرات - ۱۵۱)

اگر آپ ایک بڑے کتب خانے کے مالک ہیں اور اس کی ساری کتابیں آپ کے علم میں ہیں تو اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ امیر ہیں، لیکن ضروری نہیں کہ آپ مفکر بھی ہوں۔ آپ کے بڑے کتب خانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ بہت سے آدمیوں کی فکری خدمات حاصل کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ (شذرات - ۱۴۴)

ریاضی کے ایک خط میں اتنی رسائی ممکن نہیں۔ لیکن شاعر کا ایک خط مصرع لا محدودیت سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ (شذرات - ۱۳۹)

اسلام اور عیسائیت دونوں کو ایک مشترک حریف یعنی بت پرستی سے نبٹنا پڑا، لیکن فرق یہ ہے کہ عیسائیت نے اپنے حریف سے سمجھوتا کر لیا، اسلام نے اسے بالکل نیست و نابود کر دیا۔ (شذرات - ۱۳۶)

جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے تو پھر اس قوم کا نقطہ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک توانائی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترک دنیا اور رہبانیت موجب تسکین۔ (اقبال نامہ ۴۵)

سیاست مسلمانوں میں کوئی علیحدہ شے نہیں بلکہ خالص مذہبی نکتہ خیال سے کچھ شے بھی نہیں اور اگر کچھ ہے تو مذہب کی لوٹڈی ہے۔ (مکاتیب اقبال - ۱۰)

میں اس گھر کو صد ہزار تحسین کے قابل سمجھتا ہوں جس گھر میں علی الصبح تلاوت قرآن مجید کی آواز آئے۔ (گفتار اقبال - ۲۱۳)

کوئی قوم، قوم نہیں بن سکتی جب تک کہ وہ ابتلاؤں میں گرفتار نہ ہو۔ (گفتار اقبال - ۴۲)

اگر میری روح کے عمیق ترین خیالات کبھی پبلک پر ظاہر ہو جائیں، اگر وہ باتیں جو



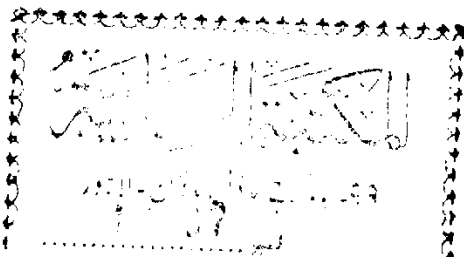
پیام منثور

میرے دل میں پوشیدہ ہیں، کبھی سامنے آ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ دنیا میرے انتقال کے بعد  
ایک نہ ایک دن بالضرور میری پرستش کرے گی۔ وہ میری کوتاہیوں کو بھلا دے گی اور آنسوؤں  
کی شکل میں خراج تحسین ادا کرے گی۔ (اقبال از عطیہ بیگم۔ ۸۲)

www.KitaboSunnat.com



## اقتبالیات



## ماخذ

کتاب ہذا کی تالیف و تدوین کے لیے علامہ اقبال کے تمام شعری مجموعوں کے علاوہ اُن کے خطبات، تقاریر و مکتوبات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ نیز مندرجہ ذیل مقالات سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے، جن کی عکسی نقول ”اقبال اکادمی لائبریری“ نے فراہم کیں۔ اس خصوصی تعاون کے لیے مؤلف کا پر داز ان لائبریری اور اقبال اکادمی کے ناظم محمد سہیل عمر صاحب کا شکر گزار ہے۔

آغا یحیٰ، ڈاکٹر	اقبال اور پاکستانی نوجوان
آفتاب حسین، سید	اقبال اور نوجوان
احمد کرم	اقبال اور نوجوان مسلم
اختر اخلاق	اقبال اور مسلم نوجوانوں کا مثالی کردار
اسرار احمد خان، سہاروی	نوجوانان و نوجوانان
اسرار احمد، ڈاکٹر	اقبال اور ہم (کتاب)
اسلم انصاری	اقبال اور نسل نو
انعام الحق کوثر، ڈاکٹر	نسل نو اور اقبال کا شاہین
بشیر ہاشمی	پیام اقبال اور نژاد نو کی ذمہ داری
پرویز، غلام احمد	اقبال کا پیغام: نوجوانان ملت کے نام
تبسم، صوفی غلام مصطفیٰ	اقبال اور بچے
توقیر احمد خان، ڈاکٹر	نوجوان: اقبال کی شاعری میں
جاوید اختر، ایم	اقبال اور نوجوان
جاوید اقبال، ڈاکٹر	اقبال اور نژاد نو کی ذمہ داری
جیلانی کامران، پروفیسر	اقبال کا نئی نسلوں کے ساتھ تعارف
حسن اختر، ڈاکٹر	اقبال اور نئی نسل
دوست محمد فیضی	اقبال اور مسلم نوجوان
رازی، پروفیسر	اقبال کا پیغام: نژاد نو کے نام
رازی، پروفیسر	اقبال کی شاعری میں مثالی نوجوان کا تصور
روبینہ کوثر لودھی	اقبال اور جوانان ملت
ریاست علی چودھری	اقبال اور نوجوان
ساجد حسین	علامہ اقبال اور مسلم نوجوانوں کا مثالی کردار
سالک حسین، سید	اقبال اور نوجوان

اقبال اور نو جوان نسل	سبح اللہ قریشی
اقبال کا پیغام، نو جوان کے نام	سلیم، عبدالقیوم
اقبال کا پیغام، نو جوان نسل کے نام	شاہد حسین، سید
اقبال کا نو جوان	صلاح الدین احمد، مولانا
اقبال اور مسلم نو جوان	طارق محمود قیصر
اقبال اور نئی پود	ظہیر الدین احمد
اقبال کے شاہین	عقیل احمد شیخ
علامہ اقبال کا پیغام: نو جوانانِ ملت کے نام	غلام حسین، شیخ
اقبال اور نو جوان	غلام علی انجم
اقبال اور نئی نسل	فرمان فتح پوری، ڈاکٹر
اقبال اور نژادِ نو	فرمان فتح پوری، ڈاکٹر
اقبال کا نو جوانوں سے خطاب	قمر دین
اقبال اور نژادِ نو	محمد احمد سبزواری
اقبال اور نو جوان	محمد جاوید بھٹی
نو جوانوں سے خطاب	محمد حسین خان
علامہ اقبال اور مسلمان نو جوانوں کے کردار کی تعمیر	محمد روز، علامہ
اقبال اور نژادِ نو	محمد ریاض، ڈاکٹر
اقبال اور نئی پود	محمد شریف بقا
اقبال اور نو جوان	محمد طارق، قاضی
اقبال اور جدید نسل	مسعود گوہر
اقبال: نو جوانوں کا شاعر	معراج تیر، سید
اقبال اور نو جوان	مظفر الحسن
اقبال اور نسلِ نو	منور رؤف
اقبال کا پیغام، نئی نسل کے نام	ناظر حسین زیدی، ڈاکٹر
اقبال کا پیغام، نو جوانوں کے نام	نبی احمد اظہر، ڈاکٹر
اقبال اور نو جوان	نصیر اختر
اقبال کا نو جوان اور اس کی تعلیم	نور الحسن ہاشمی

